اقبالؔ عاشقِ امام حسینؑ علیہ السلام

شاعر مشرق، ڈاکٹر محمدؒ اقبالؔ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام سے والہانہ عشق و محبت رکھتے تھے اور آپ کی حیات طیبہ کو انسانی زندگی کی معراج اور آپ کی عظیم قربانی کو نوعِ انسانی کیلئے ایک درسِ آزادی اور مسلمانوں کیلئے ایک کامل اُسوہ حسنہ اور مشکلات زندگی کا مکمل حل تسلیم کرتے تھے۔ علامہ اقبالؔ فخر شاہی اور فقر خانقاہی کو مسلمانوں کیلئے مضر اور اسلام کیلئے نقصان سمجھتے تھے چنانچہ ارمغان حجاز میں مسلمانوں کو ''منسلک شبیریؑ'' کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؑ　　کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ایک اور مقام پر مثنوی میں فرماتے ہیں۔

فقر عریان گر مئی بدر و حنین　　فقر عریان بانگ تکبیر حسینؑ

یعنی حقیقی فقرِ اسلامی معرکہ بدر و حنین اور تکبیر امام حسینؑ علیہ السلام ہے۔ علامہ اقبالؔ اُس تصوف سے نفرت رکھتے تھے جو مسلمانوں کو شجاعت سے دور، عمل سے بیگانہ اور کوشش و جدوجہد سے علیحدہ کر کے ترک دنیا کی طرف مائل کرے۔ وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ عزت نشینی کی زندگی چھوڑ کر نقشِ قدم امام حسینؑ پر چلیں جو صرف فداکاری، ایثاری اور قربانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خود علامہ اِسی مسلک کے پیرو تھے چنانچہ پیام مشرق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزو ست　　با من میا کہ مسلکِ شبیرمؑ آرزو ست

یعنی تیر و نیزہ و خنجر اور تلوار میری خواہیشات ہیں۔ اے نام و نہاد (مسلمان) میرے ساتھ مت چل کیونکہ میری آرزو امام حسینؑ کی طرح حق پر قربانی کرنا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نقش قدم امام حسینؑ پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ قربانی، فداکاری، ایثار اور عشقِ حقیقی کا راستہ ہے اور اسی لیے علامہ نے فرمایا۔

زندہ حق از قوتِ شبیری است　　باطل آخر داغِ حسرت میری است

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است　　پس بنائے لا الہ گردیدہ است

علامہ فرماتے ہیں پیغام حق امام حسینؑ کی شہادت سے زندہ ہے جس نے باطل کو ہمیشہ کیلئے مایوس اور نابود کر دیا ہے۔ اور اسی حق کو بچانے کے لئے امام حسینؑ اور انکے جانباز اپنے خون میں نہائے اور اسطرح اسلام کی مجدّد بنیاد ڈالی اور اُسے ہمیشہ کیلئے باقی رکھا۔ اِسی مضمون کو ۷ سو سال قبل حضرت معین الدین چشتی سنجری نے یوں ادا کیا۔

شاہ است حسینؑ پادشاہ است حسینؑ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

علامہ اقبالؔ رموز بیخودی میں حضرت سید الشہداؑ کی شان میں ایک طویل (۳۹) اشعار پر مشتمل نظم میں فرماتے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتولؑ سرو آزادے زبستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر

یعنی امام حسینؑ حقیقی عاشقوں کے امام اور حضرت فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ آپ رسول کریمؐ کے باغ کے سرو ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبالؔ اشارہ کر رہے ہیں حضرت علیؑ کے اُس جملے کا کہ ''بسم اللہ کی ب'' کا جو نقطہ جو خلاصۂ قرآن ہے میں ہی ہوں ''یعنی اللہ رے حسینؑ کی عظمت جنکا باپ بائے بسم اللہ اور جو خود ذبحٍ عظیم کی تفسیر ہیں۔ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم نہایت اسکی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیلؑ

علامہ فرماتے ہیں کی کعبہ کی داستاں سادہ اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی عجیب اور غریب معلوم ہوتی ہے اِسکی بنا جو حضرت ابراھیمؑ نے رکھی، اسکے قیام میں حضرت اسماعیلؑ نے شدّت تشنگی سے ایڑیاں رگڑیں، حضورؐ اکرم نے اسے بتوں سے پاک کیا اور حضرت امام حسینؑ نے اِسکی حرمت کو اپنی جان و مال کی قربانی دے کر بام عروج پر پہنچایا اور قیامت تک کیلئے محکم بنا دیا۔ امام حسینؑ عشق الٰہی کے پیامبر تھے اور دوسرے پیامبران عشق کی طرح اپنے عشق کا اظہار کر رہے تھے۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

سرِّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود یعنی آں اجمال را تفصیل بود

رموزِ بیخودی میں واقعہ کربلا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چوں خلافت رشتہ از قرآن گیست حُرّیت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوہ خیر الاُمم چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

بر زمین کربلا بارید و رفت لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

یعنی خلافت نے قرآن مجید سے اپنا تعلق ختم کرلیا اور خلافتِ اسلامی اور قرآنی اُصولوں کو چھوڑ کر ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور آزادی کو زہر دے دیا گیا تب محمدؐ کا نواسا، علیؑ کا بیٹا حسینؑ اس ظالمانہ روّیہ کو برداشت نہ کرسکا اور رحمت للعالمینؐ کا نواسا ابر رحمت بن کر بڑھا اور کربلا کی زمین پر خون کی ایسی بارش کی کہ کربلا کے دشت کو شہیدوں کے گلستان میں تبدیل کردیا اور قیامت تک ظلم وستم کا خاتمہ کرکے آزادی کے گلشن میں زندگی ڈالی۔ میدانِ کربلا میں امام حسینؑ اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ امتِ اسلام کی نجات کا عنوان بھی رقم کررہے تھے۔

نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت سطرِ عنوان نجات ما نوشت

پھر علامہ فرماتے ہیں۔

دشمنان چوں ریگ صحرا لاتعد دوستان او بہ یزداں ھم عدد

یعنی امام حسینؑ کے دشمن ریگستان کے ذرّوں کی طرح لاتعداد تھے جبکہ آپ کے جانباز دوست صرف یزداں کے ہم عدد یعنی بہتر (۷۲) تھے (یزداں=ی=۱۰ ز=۷ د=۴ ا=۱ ن=۵۰ =۷۲)

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں امام حسینؑ اپنی اُمّت میں ایسی اہمیت رکھتے تھے جسطرح قرآنِ مجید میں حرف قل ھو اللہ احد۔

درمیانِ امّت آں کیواں جناب ھمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

حق اور باطل کی جنگ ازل سے رہی ہے اور قیامت تک جاری رہیگی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید　　ایں دو قوت از حیات آمد پدید

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

ملّتِ اسلام کی غفلت اور ناکامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں، شہادت امام حسینؑ سے ہی تمام مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ریگ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام　　خونِ حسینؑ باز دہ کوفہ وشام خویش را

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں　　گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلۂ وفرات

قرآن مجید جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے اُسکا راز بھی حسینؑ سے سیکھا جا سکتا ہے چنانچہ اقبالؔ فرماتے ہیں۔

رمز قرآن از حسینؑ آموختم　　زآتش اُو شعلہ ھا اندوختیم

یعنی میں نے قرآن کا راز حسینؑ سے سیکھا ہے اور اسی حسینیؑ شعلے سے اپنے چراغوں کو شعلہ ور کیا ہے۔

امام حسینؑ کی شہادت کی منزلت اور عظمت کو بیان کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں۔

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر　　مرگ پور مرتضیٰؑ چیزی دیگر

یعنی ہر قسم کی شہادت مومن کیلئے فضیلت ہے لیکن ابن علیؑ کی شہادت بے مثال ہے۔

پھر فرماتے ہیں۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؑ　　بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

علامہ اپنے عشق کو بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جسطرح مجھکو شہید کربلا سے پیار ہے　　حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں میں　　کیا ڈر مقصد نہ دینگے ساقی کوثر مجھے

اے صبا اے پیکِ دور افتاد گان　　اشک ما بر خاک پاک اُو رساں

یعنی اے بادِ صبا اِس عاشقِ دور افتادہ کے آنسوؤں کو حضرت کے مزار تک پہنچا دے۔

ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں۔

قلندر میل تقریری ندارد بجز ایں نکتہ اکسیری ندارد
از آں کشتِ خرابی حاصل نیست کہ آب از خونِ شبیریؓ ندارد

یعنی یہ قلندر جو صرف تقریر کرنا پسند نہیں کرتا صرف ایک نکتہ جو اکسیرِ حیات اور ثمر زندگی ہے بتانا چاہتا ہے کہ اسلامی زمین جو بنجر اور ویران ہو چکی ہے اُس سے کوئی بھی چیز اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُسے خونِ شبیرؓ سے سیراب نہ کیا جائے۔

اقبالؔ کا تصوّرِ زمان و مکان

(معروف سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین کی تصنیف پر تبصرہ)

برصغیر کی نامور نابغہ روزگار شخصیت مرحوم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے انتقال کی افسوس ناک خبر پڑھ کر اقبالیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے یہ اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ مرحوم کے اُس اعلیٰ اور نایاب کتابچہ کا تعارف کیا جائے جو عدیم المثال ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین کی کتاب ''اقبال کا تصوّر زمان و مکان'' جو (۴۸) صفحات پر مشتمل ہے اور جسے عبدالرزاق، تاجر کتب حیدرآباد دکن نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا ہے اُس کا ایک نسخہ میرے والدِ مرحوم کی لائبریری سے مجھے ملا جو ادبی اور سائنسی اعتبار سے ایک شاہکار تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر رضی الدین نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے سائنس داں تھے بلکہ عربی فارسی اور اُردو کے ادیب ہوتے ہوئے مسائل فلسفہ اور منطق سے بھی عمیق واقفیت رکھتے تھے۔ اگرچہ اِس تعارفی مضمون میں میرے لیے یہ بات ممکن نہیں کی اِس کتاب کے تمام گوشوں اور نتائج کو پیش کرسکوں کیونکہ خود ڈاکٹر رضی الدین نے سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے لیکن بہرحال میری کوشش یہ ہوگی کی اِس گلشن فکر و خیال سے اِس طرح گذر جاؤں کہ مشامِ زمان و مکان قاری کو اس گلشن یعنی اِس کتاب کے مطالعہ کے لیے آمادہ کردے۔

زمان و مکان (Time and Space) ایک ایسا موضوع ہے جس کا تعلق دنیا کے مختلف علوم سے مستقیم اور غیر مستقیم ہے۔ علامہ اقبالؔ نے جن بنیادی مسئلوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اُن میں زمان و مکان کا سائنسی اور فلسفانہ مسئلہ بھی شامل ہے۔ اِس موضوع پر اقبالؔ کے منظوم کلام اور اُن کے نثری خطبات جو آپ نے ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن اور مدراس میں انگریزی میں دیے تھے اور جو ۱۹۳۰ء میں ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے شائع ہوئے بحث کی گئی۔ علامہ اقبالؔ خطبہ (۱۸۲) میں فرماتے ہیں کہ ''اسلامی مسائل کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو دیا جائے چنانچہ زمان اور مکان کا سوال مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ علامہ اقبالؔ کو

یقین تھا کہ اگرچہ سائنس اور حکمت محدود ہیں اور ہماری قلبی واردات اور روحانی زندگی کے لیے مشعل راہ نہیں بن سکتے لیکن آپ جدید سائنس کے اُصول کے مطالعہ اور اُن کی روشنی میں فلسفہ اور مذہب کے بنیادی مسئلوں کو ضروری سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کجا ایں خیر رابینی بگیر

(خدا نے حکمت کو نیک کام کہا ہے چنانچہ جہاں بھی یہ نیکی ملے لے لو)

علم اشیاء علم الاسا ستے ہم عصا وہم ید بیضا ستے

(علم سائنس ناموں کا علم ہے جو موسیٰؑ کے عصا اور ہاتھ کا علم ہے)

علم اسما اعتبار آدم است حکمتِ اشیاء حصار آدم است

(علم اسما سے انسان کا اعتبار قایم ہے کیونکہ اس علم سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے)

علم حرف و صوت را شہپر دہد پاکی گوہر بہ ناگوہر دھد

(علم الفاظ اور آواز کو پرواز دیتا ہے اور قطرہ سمندر کو موتی بناتا ہے)

دل اگر سوزد بہ حق پیغمبری است ور زحق بیگانہ گردد کافری است

(اگر دل حق کی تلاش کرے تو پیغمبری ہے ورنہ وہ کافری ہے)

ڈاکٹر صدیقی نے اِس کتاب میں پہلے زمان ومکان کے متعلق عوام کے عامیانہ تصوّرات، اہل یونان کے تصوّرات اسلامی علماء کے تصوّرات اور جدید فلاسفر اور سائینس دانوں کے تصوّرات بیان کر کے علامہ اقبالؔ کی اُن پر تنقید اور تائید پر تفصیل سے بحث کی ہے اور پھر علامہ اقبالؔ کے خیالات جو آیات قرآنی، احادیث پیغمبر اکرمؐ اور فلسفہ اسلامی پر مبنی ہیں بیان کیئے ہے۔

عام طور پر عوام، زمان (Time) کو ایک خارجی چیز سمجھتے ہیں جو انسان کے شعور سے اِس طرح گذرتا ہے جس طرح کوئی دریا ایک پُل کے ستونوں پر سے گذرتا ہے۔ اِس نظریہ کے تحت وقت کو موتی کی ایک مالا کہا جا سکتا ہے جس میں مختلف موتی پروئے ہوتے ہیں۔ یہ موتی درحقیقت واقعات ہیں جو ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور انکے درمیان ایک فاصلہ ضرور ہوتا ہے۔ عوام، مکان

(Space) کومختلف اشیاء کے مقامات سے تعین کرتے ہیں چنانچہ اس نظریہ کے تحت اشیاء کے درمیان ایک فاصلہ ہوتا ہے اگر چہ وہ کتنے ہی قریب کیوں نہ ہوں۔ یہ نظریات اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں۔

یونانی حکیم افلاطون نے بتلایا کہ مکان (Space) وہ ہے جس میں تمام اجسام واقع ہیں اور وہ ہمیشہ غیر متغیر ہے اس کے مطابق مکان کوئی خارجی مطلق شئے نہیں ہے۔ یونانی حکیم زینو کے مطابق کائنات سکونی ہے اور اس میں حرکت نہیں ہے۔ علمائے اسلام نے بڑی شدّت سے یونانی نظریہ زمان کی مخالفت کی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں مسلمانوں کے مختلف مکاتیب مثلاً اشاعرہ، معتزلہ، اور دیگر علماء خاص طور پر اشعری، ابن حزم اور عراقی کے افکار پر تفصیلی تنقید وتبصرہ کر کے یہ بتلایا ہے کہ کس طرح مسلم مفکّرین نے یونانیوں کے سکونی تصوّر کائنات کے خلاف بغاوت کی ہے۔ علامہ کہتے ہیں، اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا جیسی کچھ ہے اُسی سے سابقہ رکھو اور یہ فکر چھوڑ دو کہ دنیا کو ایسا ہونا چاہیے تھا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہماری کائنات ایک ارتقا پذیر متحرک کائنات ہے اور چونکہ حرکت اِس کا اساسی جزو ہے اِس لیے کائنات کے ہر نظام میں اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرّہِ کائنات

قرآن مجید کو اُم الکتاب کا لقب اِس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں ساری تاریخ عالم علت و معلول کے سلسلہ سے آزاد ہو کر ایک مافوق الدوّام ''اب'' میں سما جاتی ہے۔ علامہ اقبالؔ مشہور سائینس داں آین شٹائین کے بڑے مداح اور معرّف تھے چنانچہ ''پیام مشرق'' میں اُنھوں نے ایک پوری نظم اس نابغہ روزگار کی شان میں لکھی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ آین شٹائین کے نظریہ اضافیت کی وجہ سے مادّہ پرستوں اور دہریوں کا خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال کہ ایک غیر مادّی خالق اشیاء کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے، ہمیشہ کے لیے تمام ہو گیا کیونکہ آین شٹائین نے اپنی تجربہ گاہ میں یہ ثابت کر دیا کہ مادّہ (Material) اور توانائی (Energy) دو مختلف اشیاء نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شئے کی مختلف شکلیں ہیں چنانچہ اس انکشاف نے ایک وسیع انقلاب برپا کیا۔ علامہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں

''ذردان فرشتہ'' کے تذکرہ میں اس حرکت زمان ومکان کے فلسفہ کونظم کیا ہے۔مولانا روم فرماتے ہیں چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

ازشعور است ایں کہ گوئی نزد و دور چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

(نزدیکی اور دوری کا احساس شعور میں ہے،معراج حقیقت میں شعور کے انقلاب کا نام ہے)

این بدن باجان ما انبار نیست مشت خاکی مانع پرواز نیست

(ہمارا بدن ہماری جان کے لیے انبار نہیں ہے۔ہمارا بدن کسی طرح پرواز میں حائل نہیں ہے)

علامہ اقبالؔ نے ''فرشتہ ذردان'' کی دوصورتیں بتلائیں ہیں جن میں ان کی مراد یہ ہے کہ زمان ومکان کی اضافی خاصیت کا اظہار کیا جائے۔مولانا رومؔ اقبالؔ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں۔

برزمان وبر مکاں اسوار شو فارغ از پیچاک این زنارّ شو

(زمان اور مکان پر مسلّط ہوجاؤ اور اس گردش سے فراغت حاصل کرو)

چشم بکشا پر زمان و بر مکاں ایں دو یک حال است از احوال جاں

(اگر آنکھیں کھول کر زمان اور مکاں کا مطالعہ کروتو معلوم ہوگا یہ ہماری زندگانی کا ایک ہی رخ ہے)

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے تصور کے منافی اس سے زیادہ کوئی تصوّر نہیں ہوسکتا کہ کائنات سوائے ایک بنے بنائے نقشہ کے سوا کچھ نہیں،جس کے مطابق کام ہورہا ہے۔قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات حرکاتی ہے یہ ایک ہردم تشکیل پانے والی کائنات ہے نہ کہ ایک مکمل چیز جو اپنے خالق کے ہاتھوں سے بہت عرصے پہلے نکلی تھی اور اب فضا میں مادّہ کے ایک تودہ کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔چنانچہ بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

سلسلہ روز و شب نفس گر حادثات سلسلہ روز و شب اصل حیات وممات

سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

علامہ اقبالؔ مثنوی اسرار خودی میں فرماتے ہیں۔

اصل وقت از گردش خورشید نیست　　وقت جاوید است و خور جاوید نیست
وقت را مثلِ مکاں گسترده　　امتیاز دوش و فردا کرده
زندگی از دہر و دہر از زندگیت　　لا تسبّوا الدھر فرمانِ نبیؐ است

بال جبرئیل میں علامہ اقبالؔ نے ''زمانہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود اپنی زبان سے کرتا ہے۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے ایک صرف محرمانہ　　قریب تر ہے نمود جسکی اُسی کا مشتاق ہے زمانہ
میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں　　میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
میرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی ہے　　ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اسرار خودی میں علامہ نے مطالب کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے عرصے میں منظوم کیئے جب کہ آئین ٹھاین کا نظریہ اضافیت ابھی عام رواج پیدا نہیں کیا تھا۔ پروفیسر ایڈنگٹن کی کتاب ''نیچر آف فزیکل ورلڈ'' بھی ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی جو زمان اور مکان پر ایک شاہکارانہ بحث ہے بہر حال علامہ اقبالؔ کی فکر بھی اِن نابغہ روزگاروں سے کم نہ تھی، شاید اِسی لئے علامہ نے اپنے بارے میں فرمایا تھا۔

'' دگر دانائے راز آید کہ ناید ''

علامہ اقبالؔ کا شاہین

(شاہین کے موضوع پر علامہ اقبال کے فارسی اور اُردو اشعار پر مشتمل پہلا تحقیقی جایزہ)

کسی مشاعرہ میں بابائے ظرافت سید ضمیرؔ جعفری کا یہ مزاحیہ، طنزیہ اور سنجیدہ شعر گوش زد ہوا

ڈاکٹر اقبالؔ کا شاہین کب کا اڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

اِس مصرعہ اولیٰ میں ''اقبالؔ کا شاہین'' میری فکر و توجہ کا مرکز بنا اور اِسی شاہین کی تلاش میں سب سے پہلے میں نے پرندہ شناسی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تا کہ شاہین کے جغرافیائی، تاریخی، ماحولی، خاندانی اور فطرتی حالات کا علم ہو سکے۔ پھر اِن معلومات کی روشنی میں شاہین کو علامہ کی تحریروں اور تقریروں میں ڈھونڈنے کی کوشیش کی اور آخر میں علامہ اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام کے آئینہ میں شاہین کی مکمل تصویر اور تنویر دیکھی جس کا عکس آپ کی نظر کے سامنے ہے۔

یوں تو علامہ اقبالؔ کے شاہین پر مختلف تحریریں، اقتباسات اقبالیات کے دامن میں نظر آتی ہیں لیکن یہ پہلی تحقیقی تحریر ہے جس میں علامہ کے (۶۳) اشعار کو شامل کیا گیا ہے اور اِس موضوع پر کُل فارسی اور اُردو اشعار جن کی تعداد (۱۰۶) ہے زیر مطالعہ اور بحث قرار دئے گئے ہیں۔

علامہ اقبالؔ سے قبل اور علامہ اقبالؔ کے بعد اغلب فارسی اور اُردو کے شاعروں نے اپنے کلام میں بعض پرندوں کو اُن کی فطرت، آواز، رنگ و شکل اور ماحولی کیفیت کے اعتبار سے نظم کیا ہے جن میں مرغ عشق، بلبل، زاغ، زغن، قمری، کبوتر، عقاب، شاہین، مور، طوطا، کبک، فاختہ اور چڑیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض شعراء نے اِن پرندوں کی جمالی تصویر اور فطرتی تفسیر بھی کی ہے اور دنیائے ادب میں ان موضوعات پر چھوٹی بڑی نظمیں نظر آتی ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؔ کی طرح دنیا کے کسی شاعر نے ایک خاص پرندہ کے فطرتی تقاضوں کو تمثیلی طور پر انسان کی کامیاب زندگی کے لیے مشعل راہ بنا کر پیش

نہیں کیا۔ علامہ نے اِس بات کی کوشیش کی کہ ملت اسلامیہ دنیا کی دوسری قوموں میں اِس طرح زندگی کرے جس طرح پرندوں کی دنیا میں شاہین ۔ چنانچہ اس طرح علامہ اقبال کی مختلف فلسفانہ نظرات جن میں خودی، بیخودی، تصوّف، جہاد، اجتہاد، اور مردمومن شامل تھے، شاہین بھی شامل ہوگیا۔ اِسی لیے علامہ کی تصویر کے ساتھ بعض اوقات شاہین کا عکس نظر آتا ہے۔

۱۲/ڈسمبر ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبالؔ مولوی ظفر احمد صدیقی کو خط میں لکھتے ہیں۔ شاہین بے شک ایک پرندہ ہے اور میں نے اسے اپنے اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت بھی دی ہے۔ اِس کا اندازہ ان عوامل سے ہو سکے گا جن کا تعلق شاہین کی فطری خصوصیات سے ہے۔ میرے کلام میں شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں ہے۔ اِس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ خوددار اور غیرت مند ہے کہ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، دوسرے یہ کہ بے تعلق ہے آشیانہ نہیں بناتا، سوم یہ کہ بلند پرواز ہے، چہارم یہ کہ خلوت پسند ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ تیز نگاہ رکھتا ہے۔ میرے نزدیک اسلام میں مردمومن کی خصوصیات بھی کم وبیش یہی ہیں جو بظاہر اس حقیر سے پرندے میں پائی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے شاہین کو اپنے اکثر اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہاں اِس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ شاہین کے علاوہ اقبالؔ نے اِسی خاندان کے دوسرے پرندوں جن کی عادات واطوار شاہین کی طرح ہوتے ہیں شعری ضرورت کے طور پر استعمال کیا ہے جن میں عقاب (Eagle) شہباز (Hawk) اور دریائی عقاب (Osprey) قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ علامہ کی نثری حوالہ جات میں یہی پانچ خصوصیات شاہین کی نظر آتی ہیں لیکن آپ کے منظوم کلام میں جو اُردو میں بانگ درا، بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز اور فارسی میں اسرار خودی، رموز بیخودی، زبور عجم، پیام مشرق، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، اے اقوام مشرق اور ارمغان شامل ہیں تقریباً دس شاہین کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ یعنی (۶) شاہین کلمہ گویوں کی طرح دنیا کے ہر حصّے میں پایا جاتا ہے (۷) شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے (۸) شاہین تیز رفتار اور اس کی ضرب کاری ہوتی ہے (۹)

شاہین ہر رنگ کا ہوتا ہے (۱۰) شاہین پرندوں کی دنیا میں ممتاز اور منفرد ہے۔

علامہ اقبال کے اُردو کلام میں (۴۲) اشعار شاہین پر اور پانچ اشعار شاہین صفت پرندے باز، شہباز، اور عقاب پر ملتے ہیں۔ جس میں ایک (۸) اشعار پر مشتمل نظم ''شاہین'' بال جبرئیل میں شامل ہے۔ آپ کے فارسی کلام میں (۳۲) اشعار شاہین پر اور (۲۷) اشعار شاہین صفت باز، شہباز، پر نظر آتے ہیں جن میں دو نظمیں ''شاہین و ماہی'' اور ''پند باز بہ بچہ خویش'' ''پیام مشرق'' میں شامل ہے۔ اِس طرح اس موضوع پر کُل (۱۰۶) اشعار موجود ہیں۔

اگر چہ اسلامی حکومتوں کا زوال اٹھارویں صدی سے شروع ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی کسمپرسی اور ان کا معنوی، اقتصادی اور اخلاقی زوال انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ ساری دنیا میں ملّتِ اسلامیہ ذلّت وخواری اور تفرقہ کاری میں مبتلا تھی۔ ایسے مایوس دور میں حکم الامّت انھیں شاہین کی مثال دے کر بلند پروازی کی دعوت دے رہے تھے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک — تیرے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی

ھماں فقیہ ازل گفت جرہ شاہین را — بہ آسمان گروی با زمیں نہ پردازی

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

تیرے صید زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

زد بانگ کہ شاہینم وکارم بہ زمین چیست — صحرا ست کہ دریا است تہہ بال و پر ماست

(ترجمہ) پکارا کہ میں شاہین ہوں مجھے زمین سے کیا کام۔ صحرا ہو کہ دریا سب میرے پیروں کے نیچے ہیں)۔

گرفتم این کہ چوں شاہین بلند پروازی — بہوش با شد کہ صیّاد ما کہن دام است

(ترجمہ) چونکہ ہم شاہین بلند پرواز ہیں اس لیے ہوشیار زندگی چاہیے کیونکہ ہمارا صیاد تجربہ کار ہے۔

تو عقابی طایف افلاک شو — بال وپر بگشا و پاک از خاک شو

(ترجمہ) تم عقاب کی طرح آسمان سے وابستگی رکھتے ہو اس لیے پرواز کرو اور خاک سے پاک ہو جاؤ۔

جامعہ اسلامی میں شہنشاہی نظام ' جاگیرداری نظام ' خانقا مزاجی اور دریوزہ گری کا رواج عام تھا۔ ہر شخص کام وکاج سے کتراتا تھا اور قضا وقدر کا بہانہ کر کے مفت خوری میں مبتلا تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں دوسروں کے مال و دولت پر جمی ہوئی تھی جب کہ دنیا کی دوسری اقوام دن دوگنے رات چوگنے ترقی کر رہے تھے اور محنت اور مشقت اُن کا شیوہ تھا۔ اِس خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے علامہ نے شاہین صفت کردار کو اپنانے کی پیش کش کی تا کہ مسلمان دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور اپنی کھوئی عظمت وعزت دوبارہ حاصل کر سکیں۔

نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے　　شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں
پھرا فضاؤں میں کرکس اگرچہ شاہیں وار　　شکار زندہ کی لذّت سے بے نصیب رہا
رزق زاغ و کرکس اندر خاک گور　　رزق بازان در سواد ماہ و ھور

(ترجمہ) کوّے اور گیدڑ کا رزق قبر کی خاک میں ہے لیکن باز کا رزق چاند اور سورج کی جستجو میں چھپا ہے

دانہ دانہ گوہر از خاکش مگیر　　صید چون شاہین از افلاکش بگیر

(ترجمہ) خاک سے دانہ دانہ مت اُٹھا۔ شاہین کی طرح اپنا شکار آسمان سے حاصل کر۔

ندارد کار بادون ھمتانِ عشق　　تذرو مردہ را شاہین نگیرد

(ترجمہ) عشق کبھی پست ہمتوں سے کام نہیں رکھتا۔ مردہ تذرو کو کبھی شاہین نہیں پکڑتا۔

علامہ اقبالؔ کے نظریہ کے مطابق وطن پرستی اقدار اسلامی کے مغائیر ہے چونکہ اسلام کوئی سرحد نہیں رکھتا اِسی لئے تو حضور اکرمؐ کی حدیث کو علامہ نے نظم کر کے کہا تھا۔

مسجد من ایں ھمہ روی زمین

(میری مسجد تمام کرّہ ارض پر پھیلی ہوئی ہے)

وطن سے محبت اور وطن کی حفاظت کرنے کی اسلام تاکید کرتا ہے۔ جب بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم ممالک میں وطن پرستی کی وبا پھیلنے لگی تو علامہ نے فرمایا۔

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ ملّت کا کفن ہے

علامہ نے وطن سے پیار اور محبت کرتے ہوئے بھی ساری دنیا کے ممالک سے رشتہ برقرار رکھنے کی تاکید کی فرماتے ہیں۔

ہر مُلک مُلک ماست کہ مِلک خدائے ماست

(ہر مُلک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے)۔

اِس وطن پرستی یا آشیانہ بندی ' جدائی اور تفرقہ کو مضر جانتے ہوئے علامہ نے شاہین صفت زندگی گذارنے پر مشورہ دیا۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شاہین پہاڑوں اور چٹانوں پر اپنا خاندان تشکیل دیتا ہے اور رہبانیت کا پیرو نہیں ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر　　تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں　　کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

گذار اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں　　کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

چنین یاد دارم زبازانِ پیر　　نشیمن بشاخ درختی مگیر

(ترجمہ) بڈھے باز کی نصیحت مجھے یاد ہے کہ کبھی کسی درخت کی شاخ پر نشیمن تعمیر نہ کرنا۔

کنامی نگریم در باغ و کشت　　کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت

(ترجمہ) میرا گھر باغ اور کھیتوں میں نہیں ہے کیونکہ میری جنت تو دشت اور صحرا میں ہے۔

خلوت پسندی، اندیشہ گیری اور خودشناسی انسانی اقدار کی اعلیٰ صفتیں ہیں۔ اِس سے انسانی جوہر آشکار ہوتا ہے اور ایک بے ذر، ابوذرؓ بن جاتا ہے۔ علامہ کا مردِ مومن اِن صفات سے منزہ ہے۔ محافل شعر و رقص، درباری اجلاس و جلوس، بزم عیش و نوش، خانقاہوں کے رسومات، میخانوں کے حکایات اور میلوں عروسوں کے خرافات جامعۂ اسلامی کے لیے افیون کا قرض بن چکے تھے اور علامہ اِس نشہ کو خلوت کی ترشی سے کاٹنا چاہتے تھے چنانچہ شاہین کی خلوت پسندی کی مثال لے کر ملت اسلامیہ کو خلوت گری، خود شناسی اور خودی پر غور کرنے کی دعوت دی۔

مجو انجمن مثلِ آہو و میش　　بہ خلوت گرا چون نیا کانِ خویش

(ترجمہ) ہرنوں اور بھیڑوں کی طرح گلہ کی تلاش میں مت رہو بلکہ اپنے اسلاف کی طرح خلوت پسند بنو۔

ع۔ بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجکو

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم　　ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

فکر و تدبر، باریک بینی اور معرفت الٰہی میں غور و خوص کرنا بڑی عبادت ہے۔ یہی وہ ریاضیت تھی جس کی وجہ سے صدرِ اسلام میں وہ شخصیتیں نمودار ہوئیں جو نابغہ روزگار شمار کی جانے لگیں۔

تاریخ اسلام کا دامن اِن روشن ہستیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن جب سے ملّت اسلام نے اسلاف کے طریقہء کار یعنی غور و خوص، باریک بینی اور تجسّس سے کنارہ کشی اختیار کی ہے مسلمان روز بروز زوال اور تاریکیوں کے شکار ہونے لگے۔ چنانچہ اِسی لیے علامہ اقبالؔ نے شاہینی نگاہ جو آسمان میں پرواز کرتے ہوئے بھی ہری گھانس پر ہرے رنگ کی ٹڈی کو دیکھ سکتا ہے، علامتِ باریک بینی بنا کر دعوتِ فکر دی ہے۔ چند اشعار اس ضمن میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا　　جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

افسوس صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو　　دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

یہ مانا اصل شاہینی ہے لیکن　　تیری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسّس　　جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ فرنگ

علامہ اقبالؔ نے مردِ کامل، مردِ مجاہد، مردِ مومن، مردِ فقیر اور مردِ قلندر کے فلسفہ میں شجاعت اور دلیری کو مرکزی حیثیت دی ہے اِسی لئے تو افغانستان کے سفر پر ظاہر شاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

مُ شناسی معنیٔ کرّار چیست　　ایں مقامی از مقامات علیؑ ست

(ترجمہ) جانتے ہو کرّار کے معنی کیا ہیں یہ ایک مقام حضرت علیؑ کے مقامات (فضیلت) میں سے ہے۔

مسلم ہندی چرا میداں گذاشت　　ہمّت اُو بوی کرّاری نداشت

(ترجمہ) ہندوستاں کا مسلمان کیوں میدان سے بھاگا اس لیے کہ اُس کی ہمّت میں علیؑ کی شجاعت کی

بونہ تھی۔علامہ نے پرندوں میں شاہین کو اِسی لئے انتخاب کیا کہ شاہین جسور اور دلیر ہوتا ہے۔اگر چہ شاہین کا وزن ۴۔۵ پونڈ سے کم ہوتا ہے اور اس کے بدن کی لمبائی ڈیڑھ دو فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے لیکن پرندہ شناسی کے محققین کے خوابوں کی روشنی میں وہ جوان غزالہ، بکروں اور بھیڑوں کا بھی شکار کرتا ہے۔مشہور پرندہ شناس محقق براؤن ۱۹۷۰ء نے بیان کیا ہے کہ اُس نے شاہین کو ایک بھیڑ کے بچے کا شکار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔(برڈس انسکلو پیڈیا)

اِس شجاعت اور دلیری کو مسلمانوں کے خون میں تازہ کرنے کے لیے علامہ نے جو اشعار نظم کئے ہیں اُن میں سے چند اشعار یہاں بیان کئے جا رہے ہیں۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تن نازک سے شاہین کا جگر پیدا

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ

بازوی شاہین گشا خونِ تذروان بریز — مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

(ترجمہ) شاہین اپنے بازوں کو کھول اور تذروان پر حملہ آور ہو کیونکہ آشیانے میں خاموشی کی زندگی تیرے لئے موت ہے)۔

می فتد بر مرگ آں مرد تمام — مثل شاہینی کہ افتد بر حمام

(ترجمہ) وہ مرد کامل موت پر اس طرح لپکتا ہے جس طرح سے ایک شاہین کبوتر پر۔

سینہ ای داری اگر در خورد تیر — در جہان شاہین بزی شاہین بمیر

(ترجمہ) اگر شجاعت سے بھرا سینہ تیر کے قابل رکھتے ہو تو شاہین کی طرح زندگی کرو اور شاہین کی طرح مر جاؤ۔

نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش — جور و غیور و کلان گیر باش

(ترجمہ) نیک کام پختہ تدبیر رہو اور دلیر و غیور اور اہمیت کے حامل رہو۔

نگہ دار خود را و خورسند زی — دلیر و درشت و تنو مند زی

(ترجمہ) خوشی اور خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرو، طاقتور، دلیر اور شجاع بنو۔

شاہین چالاک اور ہوشیار پرندہ ہے۔ اِسی لئے اس کو تربیت دے کر جانوروں کے شکار اور جنگوں میں نامہ بر کبوتروں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پرندہ شناسی کا محقق زینوفر ۱۹۶۳ء لکھتا ہے کہ شکار اور جنگوں میں سب سے پہلے چار ہزار سال قبل شاہین کو استعمال کیا گیا اور پھر اس کے بعد عرب، ایران، آفریقہ اور یورپ میں اِس پرندہ سے استفادہ کیا گیا۔ گوڈون ۱۹۳۵ء میں مارکو پولو کے حوالے سے لکھتا ہے کہ شہنشاہ تاتار و چین خان آعظم اپنے قصر چانگ نور میں دو سو شاہین تربیت یافتہ شکار جنگی مہمات کے طور پر رکھتا تھا۔ علامہ نے ملت اسلامیہ کو ہوشیار اور بیدار زندگی گذارنے کی تاکید کی۔ علامہ فرماتے ہیں جس طرح شاہین دوسرے پرندوں کا شہباز ہے اُسی طرح مسلمان کو چاہئے کہ دوسری اقوام کے سردار بن کر زندگی بسر کرے۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں — کرکس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور
جانِ پدر نہیں ہے ممکن — شاہین سے تذرو کی غلامی
برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر — یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ
عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس — پرِ شاہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس
توان گرفت زچشم ستارہ مردم را — خرد بدست تو شاہین تندو چالاک است
کرکساں را رسم و آئین دیگر است — سطوت پرواز شاہین دیگر است

شاہین تیز رفتار اور اُس کی ضرب کاری ہوتی ہے۔ ماہران پرندہ شناسی نے بتلایا ہے کہ شاہین جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو وہ اوپر سے ایک تیر کے مانند اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ایک ضربہ میں شکار کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ شاہین کے حملہ کی رفتار تقریباً (۱۲۵) میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؔ ملت اسلامیہ کو تیز رفتاری اور آسمان خراشی کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بچہ شاہین سے یہ کہتا تھا عقاب سالخوردہ — اے تیرے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرکسوں میں — اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ رسم شاہبازی
وائی آں شاہیں کہ شاہینی نکرد — مرغکی از چنگ او نامد بدرد

جس طرح شاہین کے پر سرداروں کی دستار اور بادشاہوں کے تاج کی زینت رہتے ہیں۔ اُسی طرح اقبالؔ چاہتے تھے کہ مسلمان دنیا میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور وہ اُس وقت ممکن ہے جب مسلمان خرافات کو چھوڑ کر حقیقت کو اپنا مسلک بنائیں اِسی لیے تو علامہ نے فرمایا۔

شہیر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

(ترجمہ) کوّے اور زغن کے پروں کی کسی کو ضرورت نہیں اس لیے کوئی اُن کو شکار نہیں کرتا لیکن شکاریوں کی نگاہیں شاہین اور شاہباز کے پروں پر جمی ہوتی ہیں۔

علاّمہ اقبالؔ نے اپنے فارسی اور اُردو کلام میں کئی مقامات پر ملّتِ اسلامیہ کی حمیت کو للکارتے ہوئے بتلایا کہ اسلامی علوم، اسلامی اصول اور اسلامی حکمت و دانش سے فایدہ اُٹھا کر دوسری اقوام ترقی کر رہیں ہیں اور مسلمان اِن سے کنارہ کشی کر کے روز بروز گرتے جا رہے ہیں۔

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین و چرغ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روز گار

درّاج کی پرواز میں ہے شوکت شاہین حیرت میں ہے صیّاد یہ شاہیں ہے کہ درّاج

شاہین کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز

میراث میں آئی ہے اُنھیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

زندگی سوز وساز بہ ز سکونِ دوام فاختہ شاہین شود از تپش زیر دام

علامہ اقبالؔ نے خود فرمایا تھا کہ میں ع۔ شاعر فردا ھستم (میں کل کا شاعر ہوں)

وہ اپنی تمام توانائی نئی نسل کی تعمیر اور تربیت پر صرف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُنھیں یہ دکھانا تھا کہ نئی نسل جو شاہینی صفات رکھتی ہے، اُسے مکتب، مدرسے، خانقاہ اور گھریلو ماحول کبوتر صفت، درّاج مزاج اور کبک خرام بنا رہے ہیں چنانچہ اس پر شدت سے احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اُسی اقبالؔ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہین زیر دام آیا

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہین بچّے کو صحبتِ زاغ

ہر شئے ہوئی ذخیرۂ لشکر میں منتقل　　شاہیں گدائے دانہ عصفور ہو گیا

خشت را معمار ما کج می نہد　　خوی بط با بچہ ای شاہین دھد

تو اے شاہین نشیمن در چمن کردی از آں ترسم　　ہوای او بہال تو دھد پرواز کوتاہی

(ترجمہ) اے شاہین کیونکہ تو نے چمن میں آشیانہ بنایا ہے میں ڈرتا ہوں کہ اُس کی آب و ہوا تیرے پرواز کو کم نہ کر دے۔

علامہ اقبالؔ نے اِس طلسم بدبختی کو توڑنے اور ملّت کو جگانے کے لیے شاہین صفت اشعار لکھے جن میں صرف چند یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

از مقام خویش دور افتادہ ائی　　کر کسی کم کن کہ شاہین ذا دہ ئی

(ترجمہ) تو اپنے مقام سے گر چکا ہے کر کس مت بن کیونکہ تو اولاد شاہین ہے۔

جوانوں کو مری آہ و سحر دے　　پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

علامہ اقبالؔ نے اپنے آپ کو ''شاہین کافوری'' کہا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبالؔ آ گیا کیوں کر　　میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری

اِس گفتگو سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبالؔ کا فلسفہ شاہین بھی دوسرے نظرات کی طرح مستند اور محکم ہے۔ اگر چہ اِس تحریر میں علامہ کے صرف (٦١) اشعار کو رقم کیا گیا ہے لیکن تمام (١٠٦) اشعار سے استفادہ کیا گیا جو اس موضوع پر اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ مسلمانوں کے لیے شاہین وار زندگی علامہ اقبالؔ کی آرزو اور تمنا تھی۔

نہیں اقبالؔ نا امید اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی

علامہ اقبالؔ کا ابتدائی کلام

علامہ اقبالؔ نے کس سال شاعری کا آغاز کیا اُس کا مطمئن بخش جواب ہمارے پاس موجود نہیں، لیکن اقبالیات کے طالب علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کی ایک غزل سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں مجلّہ ''زبان'' میں شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت اقبالؔ کی عمر ۱۶ یا ۱۷ سال تھی اور وہ سیالکوٹ میں گیارہویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پروفیسر حمید الدین خان مدیر مجلّہ ''زبان'' نے اس غزل کے ساتھ اقبالؔ کو شاگرد بلبل ہند حضرت داغؔ دہلوی لکھا تھا یعنی اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کی اقبالؔ کو حضرت داغؔ دہلوی سے شرف تلمیذی کم از کم ۱۸۹۳ء سے رہا ہوگا۔ علامہ اقبالؔ کی یہ پہلی غزل ہے جو گلدستہ ''زبان'' دہلی کے شمارے ستمبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔

آب تیغ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا　　باغ جنت میں خدا نے آب کوثر رکھ دیا

اس کے دو مہینے کے بعد نومبر ۱۸۹۳ء میں جو غزل گلدستہ زبان دہلی میں شائع ہوئی اس میں یہ شعر خوب ہے۔ پھر اسی مجلّہ میں فروری ۱۸۹۴ء میں جو غزل چھپی اس کا مطلع یہ ہے۔

جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں　　پھر بھی یہ کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہو

چونکہ ان تینوں غزلیات میں عام پرانے اور بے لطف خیالات تھے جو ابتدائی مشق اور نوجوانی کا اثر تھا اس لئے گلدستہ زبان میں اشاعت کے باوجود اقبالؔ قارئین کو متاثر نہ کر سکے۔ لیکن ۱۸۹۴ء کی ایک غزل۔

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے　　یہ صدقہ ہوگی مرے سوال وصال کے

لاہور کے ایک مشاعرے میں پڑھی تو بڑی داد و تحسین حاصل ہوئی۔ جب اس غزل کا یہ شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیئے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو شاہزادہ ارشد گورگانی جو اُس وقت مشاعرے میں موجود تھے تعریف کر کے کہنے لگے اقبالؔ، اس عمر میں اور یہ شعر؟ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے اہل علم افراد کو اقبالؔ نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ذکر اقبالؔ کے مصنف کے قول کے مطابق اقبالؔ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی چنانچہ اُن کی

بھابی یعنی عطا محمد کی بیوی بیان کرتی ہیں کہ ''اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے ان کی آواز بہت شیریں تھی''۔ سری رام نے ''خمخانہ جاوید'' میں لکھا ہے کہ اقبال ابتدائے جوانی سے شعر اور استعداد شعر گوئی رکھتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اقبال نے پہلے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی اگرچہ آج وہ نمونے محفوظ نہیں ہیں۔

بعد میں شمس العلما میر حسن کی رہنمائی میں اُردو میں شعر کہنے لگے۔ یکتا حقانی نے ''سیرت اقبال'' میں لکھا ہے کی اقبال بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھے انھوں نے بارہا چھوٹی چھوٹی غزلیں کہیں اور اُن کاغذوں کو تلف کر دیا۔ ''شعر اقبال'' میں عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ اقبال نے ارشد گورگانی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے لیکن دوسرے محققین اقبال نے اس بات کی تصدیق نہیں کی کیوں کہ ارشد گورگانی سے ملاقات سے کئی سال قبل علامہ کا رابطہ خط و کتابت کے ذریعہ داغ دہلوی سے ہو چکا تھا اور داغ اقبال کے کلام پر اصلاح دینے لگے تھے اور یہ سلسلہ ۱۸۹۷ء میں ختم ہو گیا جب داغ دہلوی نے یہ لکھ بھیجا کہ ''اب تمھارے کلام کو اصلاح کی ضرورت نہیں'' علامہ اقبال نے فروری ۱۸۹۶ء میں ایک (۲۵) اشعار پر مشتمل نظم ''فلاح قوم'' کہی اور کشمیری مسلمانوں کے جلسہ میں پڑھی جو آگے چل کر مارچ ۱۹۰۷ء میں کشمیری میگزین میں شائع بھی ہوئی۔ ۱۸۹۶ء دسمبر کے مجلّہ ''شور محشر'' میں ایک بیس اشعار کی غزل لکھی جس کے مقطعہ میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اُس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخن داں کا

یہ غزل اقبال نے بازار حکیماں کے مشاعرے میں پڑھی جس میں مصرعہ طرح تھا۔

ع۔ مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

۱۸۹۹ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں اپنی خاص نظم ''نالۂ یتیم'' پڑھی ۱۹۰۰ء میں علامہ کی جو نظمیں منظر عام پر آئیں وہ کوہستان ہمالیہ (ہمالہ) الوداعی نظم اور ایک غزل تھی۔ اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے جلسات ۱۹۵۱ء میں ''خطاب یتیم بہ ہلال عید'' ۱۹۰۲ء میں خطاب دانشکدہ اسلامیہ بہ مسلمانان پنجاب ۱۹۰۳ء میں فریاد امت اور ۱۹۰۴ء میں ''تصویر درد'' پڑھی

لیکن جس نظم سے اقبالؔ کی شہرت سراسر ہندوستان اور پنجاب کے ہر دیہات میں پھیل گئی وہ نظم ''نالۂ یتیم'' تھی جو مسدّس کی شکل میں ۳۵ بندوں پر مشتمل تھی۔ ''کلیات اقبالؔ'' کے مرتب عبدالرزاق لکھتے ہیں، جب اقبالؔ نے یہ نظم اپنے خاص ترنم میں پڑھی تو سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ اُن کی آنکھیں اشکبار اور اُن پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی۔ اکثر بند بار بار پڑھوائے گئے۔ چاروں طرف سے چندوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اس نظم نے اقبالؔ کی شہرت کراچی سے رنگون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دی۔ روئیداد انجمن کے صفحہ (۳۰) پر لکھا ہے کہ شیخ محمد اقبالؔ نے "نالہ یتیم" جو چھپا ہوا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کے ہر ایک شعر پر تحسین و آفرین کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سیکڑوں آنکھیں تھیں جو دریائے اشک بہا رہی تھیں۔ اس نظم کے پڑھنے کے دوران تین سو روپے سے کچھ اوپر چندہ جمع ہو گیا اور کل کاپیاں اُسی وقت فروخت ہو گئیں۔ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ چار چار روپے کو بھی ایک ایک کاپی بکی۔ اس جلسہ کے صدر مولانا نظیر احمد خان نے اقبالؔ کی تعریف میں کہا کہ ''میں نے انیسؔ اور دبیرؔ کی بہت سی نظمیں سنی ہیں لیکن واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی''۔

اقبالؔ کی دوسری نظم جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ''یتیم کا خطاب ہلال سے'' ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے ایک یتیم کی دکھ بھری داستان چاند کو مخاطب کر کے سُنانے کی کوشش کی ہے۔

یہ نظم سلیس اور سادہ لفظوں میں سوز و گداز اور دردمندانہ لہجہ میں بچوں کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔

عید کا چاند آشکار ہوا　　تیر غم کا جگر کے پار ہوا
عید آئی ہے اے لباس کہن　　اب ترے چاک پھر سلائیں گے
اٹھ گئے قدرداں اپنے　　لکھ کے تختی کیسے دکھائیں گے
سننے والے گذر گئے اے دل　　اپنے شکوے کسے سُنائیں گے

۱۹۰۴ء میں اقبالؔ نے انجمن حمایت اسلام میں اپنی آخری نظم ''تصویر درد'' پڑھی جو (۱۲۸) اشعار پر مشتمل ہے لیکن بانگ درا میں صرف (۶۹) اشعار اس کے انتخاب کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم علامہ

کے ابتدائی کلام میں نہیں شامل کی جاسکتی لیکن اس کی خاص اہمیت کے لئے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔اس نظم میں وطن کا حال زار، وطن سے پیار اور اقبالؔ کا اضطراب نمایاں ہے۔ یہ وہی نظم ہے جس کو سن کر حالیؔ نے دس روپے کا چندہ دیا اور خواجہ حسن نظامیؔ نے اقبالؔ کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا۔

اس نظم کے چند اشعار پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

رولاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اور خواجہ نظامی کی اسرار خودی پر قلمی جنگ

علامہ اقبالؔ اور خواجہ حسن نظامی میں قدیم دوستی اور پُر خلوص یارانہ تھا جو زیادہ مدت تک برقرار نہ رہ سکا۔ خواجہ صاحب حضرت نظام الدین اولیا کے متولی اور انجمن صوفیان ھند کے سکریٹری تھے آپ مجلّہ توحید اور صوفی کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے عظیم نثر نگار بھی تسلیم کئے جاتے تھے چنانچہ آپ کی نثر نگاری کی تعریف میں ایک بار علامہ نے فرمایا تھا ''اگر میں خواجہ نظامی کی طرح سے نثر لکھنے کا ہنر رکھتا تو ہرگز شاعری کو اپنے افکار کے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتا''۔ خواجہ صاحب علامہ سے بہت محبت کرتے تھے اور جب کبھی علاّمہ کا قیام دہلی میں ہوتا تو ان کے لئے قوالی کی محفل سجاتے کیوں کہ علامہ قوالی کے دلدادہ تھے۔ جب ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں علامہ نے اپنی نظم نالہ یتیم پڑھی تو خواجہ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے علامہ کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا۔ علامہ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ انگلستان کے قیام کے دوران خواجہ صاحب سے فلسفہ تصوّف، اور علم لدّنی کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے۔ مکاتب اقبالؔ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان دونوں شخصیتوں میں خلوص محبت اور یارانہ تھا۔ علامہ اقبالؔ کی پہلی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کا نام خود خواجہ حسن نظامی نے انتخاب کیا تھا اور اس کے چیدہ چیدہ اشعار خواجہ نے اپنے ہفتہ وار "توحید" میں اگست ۱۹۱۳ میں شائع کئے تھے۔ لیکن اُسی دوران زمانے کے حالات ایسے بدلے کہ یہ دو جگری دوست ایک دوسرے کے سخت مخالف ہو گئے جس کی وجہ ذاتیات اور حسادت نہ تھی بلکہ مسائل تصوّف اور فلسفہ اسلامی کے سمجھنے میں تضاد اور سوئے تفاہم تھا۔ اسی لئے تو خواجہ نے اس قلمی جنگ کے دوران کہا تھا کہ ''میں اقبالؔ کی نیک نیتی پر اس لئے شک نہیں کرتا کہ اسکا دوست ہوں بلکہ اُس کو میں عظیم انسان سمجھتا ہوں کیوں کہ میں اس کے افکار اور نیّت خدمت اسلام سے باخبر ہوں"۔ مثنوی اسرار خودی کو جو اُس نے مسلمانوں کے فائدے کے لئے لکھا ہے وہ اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ مثنوی حقیقت میں مسلمانوں کے عقاید اور اُصولوں کو کمزور اور متزلزل کرے گی۔ علامہ اقبالؔ اور خواجہ نظامی میں یہ جنگ قلمی تقریباً تین سال جاری رہی یعنی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک میدان

تحریراور تقریر میں یہ دونوں لشکر فکری اور عقلی بحثوں میں مشغول رہے۔ خواجہ حسن نظامی کے لشکر میں مولانا سلیمان پھلواری، اکبر الہ آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد، ذوقی شاہ اور کئی صوفی و خانقاہ نشین شامل تھے جب کہ علامہ کے ہمراہ سراج الدین پال، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالہ عمادی، مولوی الف دین، مولوی محمود علی اور عبدالرحمان بجنوری قابل ذکر ہیں۔ ان افراد کے علاوہ کئی لوگ مستعار ناموں کے ذریعہ دونوں طرف سے اس میدان بحث میں شریک ہوئے جن میں کشاف، نقاد، ایک مسلمان، ایک فلسفی وغیرہ مستعار نام قابل ذکر ہیں۔ روزنامہ وکیل، مجلہ توحید، سراج الاخبار، مجلہ خطیب اور اُسوہ حسنہ کے علاوہ زمیندار اِن بحثوں کے میدان تحریر ثابت ہوئے۔ اگرچہ یہ جنگ قلمی ۱۹۱۴ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام میں علامہ اقبال کے خطبہ ''تصوف عجمی اور اسلام'' سے شروع ہوئی جس میں علامہ نے تصوف عجمی کو اسلام اور دین کی روح کے مغائر بتلایا اور کہا کہ اس قسم کا تصوف خودی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگرچہ ادبیات تصوف میں خودی کو ''انا'' غرور اور تکبر کے معنی میں بیان کیا گیا ہے اور چونکہ یہ صفات پسندیدہ نہیں ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس سے دوری کی تاکید کی گئی ہے، لیکن صوفیوں اور خانقاہ نشینوں نے خودی کو ''انا'' اور ''خود'' کے معنی میں استعمال کیا اور ''نفسِ خودی'' کی نفی کو اپنا شعار بتایا تاکہ معرفت کے مرتبہ پر فائز ہوسکیں۔ یہ ''نفی ذات'' علامہ کے نظریہ کے تحت اسلامی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان نہ صرف اپنی خودی کو قائم رکھے بلکہ اس میں ارتقا کے درجوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ علامہ اقبال سے معرکہ آرائی کی اصلی وجہ اسرار خودی کا دیباچہ تھا جس میں انہوں نے حافظ شیرازی پر تنقید کی تھی اور دوسرے اس کتاب کا انتساب تھا جو سر سید علی امام کے نام تھا جسے لوگ سرشناس دولت مند افراد کی خوشامد تصور کرتے تھے۔ اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں علامہ نے گیارہ اشعار حافظ شیرازی کی فکری تنقید پر شائع کئے جس کے پانچ شعر یہ ہیں۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار　　جامش از زہر اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازار او　　از دو جام آشفتہ شد دستار او
آن فقیہ ملت مے خوارگان　　آں امام امت بے چارگان

دلربای ہای او زہر است و بس چشم او غارت گر شہراست و بس
بی نیاز از محفل حافظ گذر الحذر از گوسفنداں الحذر

(ترجمہ) حافظ شرابی سے ہوشیار رہیں کہ اُس کا پیمانہ زہر سے لبریز ہے۔ اُس کے بازار میں شراب کے سوا کوئی دوسری جنس نہیں ہے اور اسی لئے اُس کی دستار فضیلت سرمستی سے پریشان ہے۔ وہ شرابیوں کا فقیہی اور بے چارہ قوموں کا امام ہے۔ اُس کی دل ربائی زہر ہے اور اُس کی نظر شہر فکر کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ حافظ کی محفل سے بے نیاز رہو اور خبردار بھیڑوں کے مندوں کی طرح زندگی بسر نہ کرو۔

ان اشعار کا شائع ہونا تھا کہ ادبی، علمی، تصوفی اور اسلامی حلقوں میں ہلچل مچ گئی جس کا ذکر آئندہ ہم اس مضمون میں کریں گے، چنانچہ اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن سے اقبال نے ان اشعار کو نکال دیا اور ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کے خط میں حافظ محمد اسلم کو لکھا کہ ''ان اشعار کے لکھنے کا مطلب صرف ادبی اصولوں کی توضیح اور تشریح تھی وگرنہ میرا حافظ کی شخصیت اور ان کے اعتقادی مسائل سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں حافظ شیرازی کو دنیا کے بہترین شعراء میں شمار کرتا ہوں، بہر حال کیوں کہ ان اشعار سے سوئے تفاہم پیدا ہو رہا تھا اس لئے میں نے ان اشعار کو حذف کر دیا ہے''۔

اسرار خودی کی قلمی جنگ کے آغاز میں پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنے دوست ذوقی شاہ کے ذریعہ علامہ کے خلاف ایک مقالہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۵ء کو مجلہ خطیب میں شائع کروایا جس میں اس بات پر تاکید تھی کہ تصوف اسلام اور روح اسلام ہے۔ ہمارا ہدف اور مقصد صرف اللہ ہے اور کوئی چیز غیر اللہ حتیٰ کہ تسخیر دنیا بھی اسلامی مقصد اور ہدف نہیں بن سکتی۔ حافظ شیرازی کی شان میں گستاخی اور مخالفت خدا کے محبوب بندوں سے اختلاف ہے جو خود خدا کی مخالفت ہے۔ اس مقالہ کا جواب اقبال کے ایک حامی نے مستعار نام کشاف کے ذریعہ روزنامہ وکیل میں ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء کو شائع کیا اور بتلایا کہ اس تحریک کی پشت پناہی خواجہ نظامی کر رہے ہیں اور یہ مقالہ اُنہی کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے اقبال کے نظریہ کو غلط بیان کیا ہے چنانچہ اسی لئے تو عالمگیر نے عوام کو دیوان حافظ کے مطالعہ سے باز رکھا تھا۔ کشاف نے لکھا کہ جس طرح انقلاب فرانس میں وہاں کے شعراء اور یونان میں لارڈ بایرن نے عوام

میں انقلابی روح بیدار کی اُسی طرح علامہ کی شاعری مسلمانوں میں خودی کو بلند اور برتر رکھنے میں سازگار ثابت ہوگی۔ ان مقالات کے بعد خواجہ نظامی میدان بحث میں اتر پڑے۔ انھوں نے مشاہیر علما اور مشایخ کو سوالات لکھ کر جواب طلب کئے اور بڑے آب وتاب کے ساتھ مختلف اخبارات اور مجلّہ جات میں شائع کروایا۔ جن افراد کے پاس سوالات روانہ کئے گئے تھے اُن میں سے اکثر افراد نے اسرار خودی کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا جن میں اکبرؔ الہ آبادی بھی شامل تھے۔ سوالات کی فہرست کچھ اس طرح تھی۔ کیا قرآن مجید نے وحدت الوجود کی مخالفت کی ہے؟ کیا توحید اور وحدت الوجود دو جداگانہ چیزیں ہیں؟ کیا حافظؔ شیرازی کی طرح بعض اصحاب رسولؐ حالت سکر میں نہ تھے؟ اسلام میں تصوّف کا مقصد اور ہدف کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ان سوالوں کے تمام جوابات علامہ کی مخالفت اور خواجہ نظامی کی موافقت میں تھے اِسی لئے خواجہ صاحب کے حامیوں کا دائیرہ روزانہ وسیع تر ہوتا گیا۔ خواجہ صاحب نے لکھا کہ اگر حافظؔ کا کلام مسلمانوں کو بُزدل اور ناکارہ بنا دیتا ہے تو کیا اصحاب رسولؐ جنھوں نے دین کو دنیا پر مقدم جانا بڑی بڑی فتوحات انجام نہیں دیں۔ کیا اس فلسفہ میں مغربی فلاسفروں کی روح بول نہیں رہی ہے؟ اگرچہ میں اقبالؔ کا دشمن نہیں ہوں لیکن میری قدیم دوستی بھی صحیح عقاید کو بیان کرنے میں حائل نہیں ہوسکتی۔

۲۴ر جنوری ۱۹۱۶ء کو سراج الاخبار جہلم میں ایک مستعار نام فلسوف مسلمان نے اقبالؔ پر الزام لگایا کہ وہ حافظؔ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حافظؔ کا تصوّف قرآنی اصولوں سے جدا نہیں ہے۔ اقبالؔ کی فکر

ناچنانہ آئے آنگن ٹیڑھا کی مصداق ہے

ان مقالات کا جواب اقبالؔ کے دوسرے حامی مولوی الف دین نے دیا جو وکیل اخبار میں شائع ہوئے پھر ایک طولانی مضموں خواجہ حسن نظامی کی جانب سے ۳۰ر جون ۱۹۱۶ء کو مجلّہ خطیب میں شائع کیا گیا جس میں انھوں نے مثنوی اسرار خودی کو مسلمانوں کے لئے مضر اور غیر معقول بتاتے ہوئے چند وجوہات لکھیں جو تحریف اور غلط تفسیر کے ذریعہ عوام کو علامہ کے خلاف ورغلانے کے لئے تھیں۔ خواجہ صاحب نے بتلایا کہ (۱) علامہ نے جو اشعار خودی کی حفاظت اور ترقی کے لئے بیان کئے ہیں وہ کوئی

نئی چیز نہیں ہے بلکہ قرآنی تعلیمات میں اس سے زیادہ اس مسئلہ پر مواد موجود ہے چنانچہ قرآن کو رکھتے ہوئے ہمیں مثنوی اسرار خودی کی ضرورت نہیں ہے (۲) اقبالؔ مسلمانوں کو یورپ کے فلاسفروں کے فلسفے کی پیروی کرنے کی تعلیم دے رہے ہیں جو غلط ہے (۳) اسرار خودی کے مقدمہ میں اقبالؔ نے فلسفہ وحدت الوجود اور صوفیانہ عقاید پر انتقاد کیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ صوفیوں کو نابود کیا جائے اور چونکہ یہ مہم کامیاب نہیں ہوسکتی اس لئے اس مثنوی کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

اس قلمی جنگ سے قبل علامہ نے ایک خط میں خواجہ صاحب کو لکھا تھا کہ انھوں نے مولانا رومؔ کو خواب میں دیکھا اور مولانا نے اُنھیں اسرار خودی لکھنے کی تاکید کی ہے چنانچہ اس تحریر سے فایدہ اٹھا کر خواجہ صاحب نے لکھا کہ اقبالؔ نے مولانا رومؔ کو خواب میں تو دیکھا لیکن اُن کی مثنوی کو بیداری میں نہیں پڑھا کیونکہ اگر وہ مثنوی پڑھتے تو کبھی یہ مثنوی نہیں لکھتے۔ جب اتہام اور الزامات کا بازار ہر طرف سے گرم ہوا تو علامہ اقبالؔ نے اپنی صفائی اور اسرار خودی کی تائید میں ایک مقالہ خواجہ صاحب کے جواب میں "راز اسرار خودی" لکھا جو ۹ر فبروری ۱۹۱۶ء کو اخبار وکیل میں شائع ہوا جس میں علامہ نے مفصل بحث کر کے خواجہ صاحب کے تمام تر سوالات کے جوابات لکھے اور اسرار خودی کو مسلمانوں کے لئے ایک مفید کتاب بتلایا اور اسرار خودی کا انتساب سر سید علی امام کے نام امیروں کی خوشامد اور لالچ نہیں بلکہ اُن سے اظہار محبت اور دوستی کی دلیل نامزد کیا۔

۲۸ر جون ۱۹۱۶ء کو اخبار وکیل میں علامہ نے ایک مقالہ علم ظاہر و علم باطن کے عنوان سے شائع کیا اور اس میں صوفیوں میں پھیلے ہوئے سوئے تفاہم کو کم کرنے کی کوشیش کی اور بتایا کہ جس تصوّف سے اصل اور قوانین اسلام میں پایداری اور خلوص پیدا ہوتا ہے وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عینِ اسلام ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ نے تین مقالے ''تصوف وجودی'' پر لکھے جس میں ایک مقالہ روز نامہ وکیل میں ۱۳ر ڈسمبر ۱۹۱۶ء کو شائع ہوا۔ علامہ نے انگریزی میں بھی ایک مکالمہ اسلام اور تصوّف لکھا جو جنوری ۱۹۱۷ء کے میگزین New Era میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے ان مقالات کے علاوہ خطوط کے ذریعے اکبرالہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مہاراجہ کشن پرشادؔ، اور دیگر مشاہیر علماء سے یہ استدعا

کی کہ قبل از ہر گونہ اعتراض ان کی مثنوی کا مطالعہ کریں۔ چنانچہ ۲۰ر جنوری ۱۹۱۸ء اور ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں کہ میرا اعتراض حافظ شیرازی پر ادبی تنقید ہے۔ جدید علوم اسلام کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اصلی دشمن مسلمانوں کی وطن پرستی یا Nationalism ہے جس کی وجہ سے ترکی خلافت ختم ہوئی۔ اسلام کا مسئلہ اسلامی ایک قوم کا تصور ہے جس کا مرکز کعبہ ہونا چاہیے۔ اقبال نے یہ بھی لکھا کہ آپ نے مجھ پر الزام لگایا جو صحیح نہیں ہے۔ آپ سے یہ میری التجا ہے کہ کم از کم ایک بار اسرار خودی کا مطالعہ کریں اور پھر اظہار نظر دیں۔ جس طرح شبلی کے پتھر سے منصور کو زخم لگا اور تکلیف ہوئی اُسی طرح آپ کے اعتراض سے مجھے اذیت پہنچی ہے۔

۲۴ر جون ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں کہ مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ آپ بھی خواجہ صاحب کے ہم خیال ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنی مثنوی میں جرمنی فلسفہ کے سوا کوئی چیز جدید پیش نہیں کی۔ اگر کوئی شخص فلسفہ وجودی کا مخالف ہے اُس کے معنی یہ نہیں کہ وہ تصوف کا مخالف ہے۔ مجھے حقیقی تصوف اسلامی سے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بہر حال تصوف وجودی کا دین سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اکبر الہ آبادی اقبال اور حسن نظامی کی عظمت کے قایل تھے چنانچہ انھوں نے اس قلمی جنگ کی آگ بجھانے کی دونوں کو تاکید کی۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نیکلسون نے لندن میں اسرار خودی کا ترجمہ شائع کیا۔ نیکلسون نے دیباچہ میں لکھا کہ اقبال کے احساسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پر احساس مسلمان ہے جو اسلام سے خلوص رکھتا ہے وہ ایک ایسی حکومت اسلامی کا قائل ہے جس میں قومی اور ملّی بندش نہ ہو اُس کا مقصد ایک عظیم اسلامی حکومت کی بنیاد گذاری ہے جس کا مرکز کعبہ اور جس کا ایمان خدا اور رسولؐ پر ہو۔ ایک مشہور انگریزی نقاد Dixon نے اسرار خودی کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اقبال کے انسان کامل فلسفہ جرمن کے فلاسفر نیچے اور فرانس کے دانشمند برگسون کے خیالات کا نچوڑ ہے۔ یہ فلسفہ ایک مخصوص اور محدود طبقہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی یہ فلسفہ پسماندہ اقوام اور خصوصی طور پر مسلمانوں کو جنگ کا سبق دیتا ہے اور اس فلسفہ کا ہر لفظ سیاسی قدرت اور طاقت سے لبریز ہے۔

علامہ اقبالؔ نے Dixon کے جواب میں لکھا کہ اگرچہ میرا فلسفہ عالمگیر ہے اور محدود نہیں کیوں کہ انسانی دوستی شاعری اور فلسفہ میں ہمیشہ جہانی رہی ہے مگر اگر کوئی انسان اِن مسائل کو ایک جامعہ میں پورا کرے تو وہ جامعہ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ ان اقدار کو پوری طرح سے اپنے میں جذب کرنے کی قدرت رکھے اور وہ صرف جامعہ اسلامی ہی ہوسکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ فلسفہ اسرار خودی کو میں نے اسلامی حکیموں اور صوفیوں سے حاصل کیا ہے چنانچہ برگسون کا یہ کہنا کہ یہ مغربی فلاسفروں کی دین ہے غلط ہے، بدبختی یہ ہے کہ مغربی افراد فلسفہ اسلامی سے بے خبر ہیں۔

اسرار خودی کے انگریزی ترجمے پر ۲۵ راگست ۱۹۲۱ء کو امریکہ کے اخبار Newage میں تبصرہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ مثنوی ہندوستانی مسلمانوں میں محشر برپا کردے گی۔ تمام مغربی ممالک میں اگرچہ اسرار خودی پر تبصرے ہوئے لیکن اسلامی ممالک بالکل خاموش رہے کیوں کہ وہاں کے حکمران اس کو اپنے مفاد کے خلاف جانتے تھے اِسی لئے تو علامہ نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ ''میں نے جس ملّت کے لئے اس مثنوی کو لکھا اُس نے اِسے بالکل نظر انداز کر دیا یا پھر توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا اور نہ اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشیش کی، مگر دوسری قومیں جن کے بارے میں اس میں بات چیت نہیں ہوئی اور جن کو میں نے مخاطب نہیں کیا اِس کا مقصد اور مفہوم سمجھنے میں آگے رہے چنانچہ اِسی لئے تو علامہ نے مہاراجہ کشن پرشادؔ کو خط میں اُن کے سر کے خطاب ملنے پر اس خطاب کی بڑی وجہ ان کی تخلیق اسرار خودی کا دوسری زبانوں میں ترجمہ اور اُس پر مفکران جہان کے تبصرے قلمبند کیا۔

ہم اس مضمون کو علامہ کے ہی شعر پر ختم کرتے ہیں۔

آشنا از لذّتِ گفتار شو　　اے درائے کاروان بیدار شو

علامہ اقبالؔ اور اکبرؔ الہ آبادی

علامہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتے تھے اور تہ دل سے اُن کی عزت و احترام کے قائل تھے۔ اگرچہ اکبرؔ الہ آبادی عمر میں اقبالؔ سے (۳۱) سال بڑے تھے لیکن تفاوت عمر کے باوجود وہ اقبالؔ کو اپنا دوست اور غمخوار جان کر اپنے نجی اور خصوصی قلبی حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے اقبالؔ اور اکبرؔ کی جان پہچان انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ہوئی جہاں اقبالؔ نے حالیؔ، شبلیؔ، گرامیؔ، خواجہ حسن نظامیؔ اور دیگر مشاہیر سے ملاقات کی تھی، لیکن ان دونوں ہستیوں میں مخلصانہ دوستی ۱۹۱۱ء سے شروع ہوئی جو دس سال یعنی اکبرؔ کی وفات ۱۹۲۱ء تک برقرار رہی۔ ''مکاتیب اکبرؔ'' کے ترتیب کار مرزا سلطان احمد کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے پاس اکبرؔ کے کئی خطوط موجود تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ ''سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ بھی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ حضرت اکبرؔ کے جو خطوط ان کے نام ہیں ان کا ایک انتخاب مع مقدمہ کے شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے''۔ افسوس کہ علامہ اکبرؔ کے انتقال کے بعد (۱۷) سال زندہ رہے لیکن یہ خطوط شائع نہ ہو سکے اور آج ان خطوط کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ اس وقت ادب کے دامن میں صرف اکبرؔ کے پانچ خطوط بنام اقبالؔ موجود ہیں جن میں سے دو خط اقبالؔ نامہ اور تین خطوط اقبالؔ کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے خصوصی ''اقبال نمبر'' میں شائع ہوئے تھے۔ البتہ اقبالؔ نے جو اکبرؔ کے نام خطوط لکھے اُن میں سے سولہ (۱۶) خطوط شیخ عطا اللہ کے مرتب کردہ مجموعہ ''خطوط اقبالؔ نامہ'' حصہ دوم میں شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ نے اکبرؔ کے خطوط کو محفوظ کیا تھا جس کا ذکر خود اقبالؔ نے اپنے ۹ رنومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں یوں کیا ہے۔ ''آپ کے خطوط جو میرے پاس محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے مگر میں خود لمبا لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں ہے کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں''۔ اس کے علاوہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور

مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔ اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔'' ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ ابھی تو مسلمانوں کو اُن کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ ''زمانے'' کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھئے جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار بڑھوں گا بالخصوص اِس شعر نے۔ ع۔ جب علم ہی عاشق دنیا ہوا۔ بہت اثر دل پر کیا۔

اقبالؔ ۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ ''میں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے''۔

طعنہ زن ہے ضبط اور لذّت بڑی افشا میں ہے ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داروں کے لئے

علامہ کی آرزوے ملاقات ۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو پوری ہوئی جب وہ خواجہ نظامیؔ اور مرزا جلال الدین کے ہمراہ کانپور کے دورے کے بعد اکبرؔ الہ آبادی سے ملنے الہ آباد گئے اور پھر دہلی گئے اور حکیم اجمل خان سے ملاقات کی۔ اسی ملاقات کا ذکر اکبرؔ نے اپنے خط ۹ر جنوری ۱۹۱۳ء میں اس طرح سے کیا ہے ''آپ کا تشریف لانا نہایت باعث انبساط قلب ہوا بہت افسوس ہوا کہ آپ کی تواضع و تکریم کا موقع نہ ملا لیکن اس سے زیادہ اس بات کا کہ مبادلہ خیالات کا موقع بہت کم ملا۔ خدا جزاے خیر دے''۔

اقبالؔ اور اکبرؔ کی ملاقاتیں اور نامہ نگاریاں دراصل دو عظیم مفکّروں، دو اسلامی فلاسفروں اور دو عظیم شاعروں کی انجمن آرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور ایک دوسرے کے اشعار کی داد دیتے اور لیتے ہوئے سرشار اور خوش نظر آتے ہیں۔ اکبرؔ اپنے خط ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں ''آپ کی نظم سوز میں نے پڑھی۔ ماشاء اللہ چشم بدور۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقایق کی طرف ہے۔

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر۔

کس قدر بلیغ وصحیح ولبریز معنی ہے۔ اگر چہ یہ لطیف وخوب صورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا لہجہ ہے۔ الغرض جملہ شعر لاجواب ہیں''۔

اقبال نے ۱۷/دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ کل خط لکھ چکا ہوں۔ مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا۔

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں　　عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ۔ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔ ہیگل لکھتا ہے کہ اصول تناقض ہستی محدود کی زندگی کا راز ہے اور ہستی مطلق کی زندگی میں تمام قسم کے تناقض جو ہستی محدود کا خاصہ ہیں، گداختہ ہو کر آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ اسی رنگ کے فلسفانہ اشعار اور بھی لکھیئے کہ خود بھی لذت اٹھاؤں اور اوروں کو بھی اس لذت میں شامل کروں''۔

اقبال کبھی یوں رقم طراز ہیں۔

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو　　غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں۔ اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آیا۔ کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ (مکتوب ۲۵/اکتوبر ۱۹۱۵ء)

اقبال ۲۵/اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں اکبر کو لکھتے ہیں۔ ''چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا۔

ایں سر خلیل است با آذر نتواں گفت

غور فرمایئے۔ کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجئے''۔

اکبر اور اقبال اولین ملاقات ہی سے ایک دوسرے کے لئے دل میں خاص جگہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال زعفران بھیجتے ہیں تو اکبر ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۱ کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''تہ دل سے مشکور ہوں۔ خانہ احسان آباد۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ میرے روحانی دوست نے مجھ کو تحفہ عنایت فرمایا۔ اس خیال میں بڑی لذت ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میرے اسلامی بھائی نے تحفہ بھیجا۔ یہ ایک شرعی بات ہے

اوران روزوں بڑے جھگڑے کی بات ہے''۔ اِسی طرح جب اکبر نے اقبال کے لئے لنگڑے آموں کی پیٹی بھیجی تو اقبال نے اس تحفہ پر خوب صورت اشعار لکھ کر روانہ کیے۔

اگر اقبال اپنے دل کا دکھڑا اکبر کے سامنے روتے تو اکبر بھی اپنے دل کا حال اُن تک لفظ لفظ بیان کر دیتے تھے۔ ناقدین ادب اور محققین اقبالیات کہتے ہیں کہ اکبر سے ہی متاثر ہو کر اقبال نے ظریفانہ اشعار کہے جو آج ان کے مجموعہ میں موجود ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ۳/ مارچ ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھا ''میرے ظریفانہ اشعار سے کبھی بہت زندہ دلی اور شوخی کا قیاس ہو سکتا ہے لیکن عادتاً وہ بھی ایک اسلوب ادائے خیال ہے۔ ورنہ بے حد افسردہ رہتا ہوں اور نہ بھی افسردہ رہوں تو ایک حسرت سی رہتی ہے''۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کی یہ افسردگی آخری عمر میں اُن کے چھوٹے لڑکے ہاشم کے مرجانے سے بہت بڑھ گئی چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''مرحوم ہاشم کے ساتھ لٹریری دنیا کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ تین دن ہوئے بے ساختہ یہ اشعار ذہن میں آئے جن سے میری طبیعت کی مایوسی اور خون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ چمن ہی جل گیا جس میں لگائے تھے شجر — اب تجھے پا کر میں اے باد بہاری کیا کروں
صفحہ ہستی سے ہوا محو اپنا نقش زندگی — جب یہ مضمون پیش ہے مضمون نگاری کیا کروں
کہتے ہیں احباب کر دنیا میں اکبر کوئی کام — حسرت و حیرت مگر مجھ پر ہے طاری کیا کروں

۱۳۱۳ھجری میں جب اقبال کی والدہ کا انتقال ہوا تو اکبر الہ آبادی نے اس غم میں شریک ہو کر اشعار لکھے جو کلیات اکبر میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ فارسی مین لکھا جو مرحومہ کی سنگ قبر پر کندہ ہے۔

مادر مرحومہ اقبال رفت — سوی جنت زیں جہاں رفت
گفت اکبر با دل پردرد غم — رحلت مخدومہ ''تاریخ یافت'' (۱۳۱۳ھجری)

اگر اکبر الہ آبادی کی میاں جگری نہ ہوتی تو خواجہ حسن نظامی اور اقبال کی قلمی جنگ جو اسرار خودی کے دیباچہ اور حافظ کے متعلق اشعار سے شروع ہوئی تھی، کبھی ختم نہ ہوتی۔ اس طرح دونوں شخصیتوں کے

حامیوں میں یہ آتش زور پکڑتی جو ادب اور مذہب دونوں کیلئے نقصاں رساں اور نا قابل تلافی ضرر ثابت ہوتی۔ جب اقبالؔ نے اسرار خودی میں حافظؔ شیرازی پر اسلامی تصوفی نظریہ سے حملے کئے اور اس کی مخالفت میں خواجہ نظامی نے ایک محاذ قایم کیا اور اقبالؔ پر جوابی حملوں کی بوچھار کردی۔ اگرچہ اکبرؔ حافظؔ کی تائید میں نظامیؔ کے ہم آواز تھے لیکن وہ اقبالؔ کی نیک نیتی سے واقف تھے۔ اقبالؔ ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کے خط میں اکبرؔ کو لکھتے ہیں۔

''میں نے خواجہ حافظؔ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ اُن کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظؔ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اور اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے خواجہ حافظؔ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا اور نہ ان کی شخصیت سے، نہ ان کے اشعار میں ''مے'' سے مراد وہ مئے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں۔ بلکہ اُس سے وہ حالات سُکر مراد ہے جو حافظؔ کے کلام سے بخیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔ معاف کیجئے گا مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظؔ کے متعلق لکھے گئے تھے۔ کاش آپکو اُن کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تا کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے۔

علامہ اس خط کے ۵ ہفتہ بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی کو اب تک نہیں پڑھا۔ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجئے۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر سے زخم آیا اور اُس کی تکلیف سے اُس نے آہ وفریاد کی اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے''۔

اکبرؔ نے ایک طرف اپنے ارشادات سے خواجہ حسن نظامیؔ کو وادار کیا کہ وہ شخصیت پر حملہ کرنے سے گریز کریں اور فلسفہ وحدت الوجود کے لئے قرآن سے استناد پیش نہ کریں تو دوسری طرف اقبالؔ سے کہا کہ وہ حافظؔ پر جارحانہ حملے اور تصوّف کے خلاف تند تحریروں سے باز رہیں۔ چنانچہ اقبالؔ نے حافظؔ سے متعلق سخت اشعار اور دیباچہ کے سخت وتند جملوں کو اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن سے

حذف کر دیا۔ اس قلمی جنگ کی ابتدا میں اکبر نے حسن نظامی کو لکھا۔

حضرت اقبال اور خواجہ حسن　　پہلوانی اُن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے　　آؤ گھتا ئیں خدا ہی کے لئے
درزشوں میں یہ تکلف ہی سہی　　ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص　　می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

لیکن جب دونوں میں یہ معاملہ بڑھ گیا تو حسن نظامی کو یوں مشورہ دیا۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد　　قومی رکنوں کے ہیں نگہبان، وہ بھی
تم محو ہو حُسن کی تجلی میں اگر　　ہیں دشمنِ فتنہ رقیباں وہ بھی

بہر حال یہ اکبر الہ آبادی ہی کی کوشش تھی کہ پھر یہ دو دل ایک دوسرے سے جڑے رہے۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم علامہ اقبال کے اکبر کی وفات پر ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء پر تاثرات بیان کرتے ہیں جو اقبال کے دل میں اُن کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔

''اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر اُسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لئے جاری رہتا''۔

علامّہ اقبالؔ اور مہاراجہ سر کشن پرشادؔ

مہاراجہ کشن پرشادؔ، مہاراجہ نریندر بہادر کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال بہادر کے پوتے تھے، جن کے جد راجہ ٹوڈرمل شہنشاہ اکبر کے وزیر مالگواری تھے جن کا اصلی وطن لاہور تھا۔ مہاراجہ خوش اخلاق ادب نواز اور گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے۔ آپ کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر تھے اور شادؔ تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی میں نعتیہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کی نعتوں کا مجموعہ آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔ آپ کے کچھ نعتیہ اشعار آج بھی مسجد نبویؐ سے مسلکہ شیخ الاسلام کتب خانہ کی دیوار پر نقش ہیں۔ مہاراجہ کو اُردو کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں پر کافی عبور حاصل تھا۔ مہاراجہ سپاہ گری، علم رمل، علم نجوم، خطّاطی، نقاشی کے علاوہ موسیقی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی سالانہ جاگیر (۱۶) لاکھ روپیوں سے متجاوز تھی۔ دیوڑھی اشرافانہ تھی لیکن عادت فقیرانہ اور درویشانہ۔ مہاراجہ کی چار مسلمان بیویاں اور تین ہندو بیویاں تھیں۔ مسلمان بیوی کی اولاد کو مسلمان طریقے سے پرورش کرتے اور اُن کے لیے مسلمان گھروں میں رشتے کرتے تھے۔ ہندو بیوی کی اولاد کو ہندو طریقے سے پرورش کر کے ان کے لیے ہندو گھروں میں رشتے قائم کرتے۔ خود مسجد بھی جاتے اور سورھائی قرانی کی تلاوت کرتے اور مندر بھی جا کر عقیدت کا اظہار کرتے۔ آپ کی زندگی کے آخری دور میں افواہ پھیلی تھی کہ مہاراجہ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن یہ بات غلط تھی چنانچہ کسی مقام پر حضورؐ نظام کو مخاطب ہو کر کہا تھا

تو خدا پرشاد ہے میں کشن پرشاد ہوں

موصوف کی وصیت کے مطابق ۱۹۴۰ء میں انتقال کے بعد اُن کی آخری رسومات ہندو طریقے پر انجام دی گئی اور اُن کے بیٹے خواجہ پرشاد جو ہندو بیوی کے بطن سے تھے اُن کے جانشین قرار دئے گئے جن کو کچھ عرصے بعد ایک انگریز سپاہی نے اُس کی معشوقہ سے روابط رکھنے کی وجہ سے بمبئی میں تاج محل ہوٹل کے اوپری طبقہ سے پھینک کر قتل کر ڈالا۔

کچھ عرصے قبل میری ملاقات نواب معین جنگ بہادر کے پوتے نواب تقی خان صاحب سے شمالی امریکہ میں ہوئی جنھوں نے مختلف حقایق پر روشنی ڈالتے ہوئے مہاراجہ کے بڑے فرزند نواب اسد اللہ خان کی شادی جو نواب داؤد جنگ کی چھوٹی لڑکی قیصر النساء بیگم سے ہوئی اُس کی تفصیلی روداد فرمائی جو مکمل طور پر ایک مسلمان اشرافی خاندان کے گھر کی شادی کی تصویر تھی۔ علامہ اقبال اور مہاراجہ کے تعلقات کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مہاراجہ کے جد کا تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہونے کے علاوہ، مہاراجہ اقبال کی طرح فقیرانہ عادت اور درویش صفت اوصاف اور صوفیانہ خیالات سے ہمکنار تھے اقبال کی طرح مہاراجہ بھی داغ دہلوی کے اُن شاگردوں میں شامل تھے جن پر داغ کو فخر تھا۔ اقبال کی طرح مہاراجہ بھی اُردو اور فارسی میں اشعار کہتے اور مہاراجہ کو بھی حضورؐ اکرم سے بے نہایت محبت اور عقیدت حاصل تھی جو اُن کے مجموعہ گلبن نعت سے ظاہر ہے۔ مہاراجہ علامہ اقبال کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور قدر دانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ علامہ اقبال پر نادان مولویوں اور دانا متعصب ہندوؤں کے اعتراضات کا طوفان تمام برّصغیر میں پھیلا ہوا تھا۔ نادان مولویوں جن کی ایک معمولی مثال مولوی دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان کا فتوی ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کو کافر اور مسلمانوں کو علامہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا اُن کے معاشرت برقرار رکھنے کو عظیم گناہ قلمبند کیا تھا۔ دوسری طرف اردو معلّیٰ کے حامیوں کی آڑ لے کر چند دانا ہندو ادیب جن میں برق ملسانی کے والد جوش ملسانی سرفہرست ہیں جنھوں نے مستعار نام حضرت جرّاح کے نام کے ساتھ اقبال کی زبان دانی اور اُن کے کلام کی فنی غلطیوں پر لاہور کے اخبار ''پارس'' میں مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ مجلّہ اُردو معلّیٰ میں حسرت موہانی اور برج نرائین چکبست لکھنوی کے علاوہ پنچ اودھ اخبار میں دیگر قابل افراد نے بھی علامہ اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت سے حسد کر کے علامہ کے کلام کو غلط اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ ایک اور محاذ پر شادی لعل جیسے افراد علامہ کے قلم سے رواں طوفان کو روکنے میں شبانہ روش مصروف تھے بہر حال ان حالات میں مہاراجہ کی مکمّل ہمدردی علامہ اقبال کے ساتھ تھی اور اِسی لیے یہ دوستانہ تعلقات اتنے گہرے ہو گیے تھے کہ مرا اسلاتی تحریروں سے ہمیں پتہ

چلتا ہے کہ مہاراجہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں بھی علامہ اقبال سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ لاہور تشریف لائے۔ اقبال تمام مدّت مہاراجہ کے ساتھ رہے۔ لاہور میں قیام کے دوران مہاراجہ نے محسوس کیا کہ اقبال تنگ دستی کا شکار ہیں کیونکہ تین بیویاں اور دو بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ زمانے کی نیرنگیاں اقبال کو نشانہ بنائی ہوئیں ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچ کر فوراً اقبال کی معاشی حالت کو بہتر کرنے کا بندوبست کیا۔ ہمیں معلوم نہ ہوسکا کہ مہاراجہ نے کیا مبلغ یا پیشکش اقبال کے لیے کی لیکن اقبال کے خط سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اِسے قبول نہیں کیا اور واپس کر دیا۔ اُن کے اُس خط کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ ''مجھے معلوم نہیں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ دوست نوازی اور غریب پروری آپ کا خاندانی وطیرہ ہے۔ آپ کا یہ فیض مجھے ایک لمحے میں ثروت مند کر دے گا لیکن میری طبیعت اور میری دیانت داری کا یہ تقاضہ نہیں کہ اُجرت تو آپ سے حاصل کروں اور اُس کے مقابل آپ کا کوئی کام نہ کرسکوں۔ ہمیشہ کی طرح اقبال آپ کا معنوی دوست ہے اور رہے گا۔ آپ نے جو اپنے صمیم قلب سے محبت کی ہے وہ ہمیشہ دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گی''۔

فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے غم اور دکھ صرف اُسی شخص سے بیان کرتا ہے جسے اُس سے محبت اور ہمدردی ہو۔ ۹ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ امام بی نے انتقال کیا اُس وقت اقبال کی عمر (۳۷) سال تھی۔ ذکر اقبال کے مصنف عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ جب میں پرسہ دینے کے لیے اقبال کے گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ اقبال اپنی ماں کو یاد کر کے اس طرح رو رہے تھے جس طرح ایک نابالغ فرزند اپنی ماں کو روتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ جناب اکبر الہ آبادی نے علامہ کی والدہ کی وفات پر فارسی میں قطعہ تاریخ وفات لکھا جو مرحومہ کی قبر پر کندہ ہے۔

بہر حال پرُسے کے خط کا جواب علامہ کی طرف سے مہاراجہ سے اُن کے گہرے تعلقات کی دستاویز ہے۔ حکومت انگلستان نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا، علامہ نے مہاراجہ کو خط کے جواب میں لکھا کہ یہ خطاب مجھے حکومت انگلستان نے اسرار خودی کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا ہے

جس پر انگریزی زبان مین ترجمہ ہونے کے باعث یورپ اور امریکہ میں کئی تبصرے شائع ہوئے ہیں جب ہندو مسلمان فسادات کے شعلے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے اور پنجاب بھی اُس کی زد میں شعلہ ور تھا اُس وقت ۱۹ر مارچ ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبالؔ نے مہاراجہ کو خط میں لکھا کہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پنجاب میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت اپنی اوج پر پہنچ چکی ہے اور اگر یہی حال جاری رہے تو آیندہ (۳۰) سالوں میں ان ملتوں کا مل کر زندگی کرنا بہت دشوار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی یہ پیشن گوئی بھی بالکل صحیح نکلی چنانچہ اس یادداشت کے کوئی (۲۵) سال بعد برصغیر میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ علامہ اقبالؔ کے انتقال کے کوئی تین مہینے قبل جنوری ۱۹۳۸ میں وزیر آعظم حیدرآباد دکن سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپیہ کا چیک بھیجا جو یوم اقبالؔ کے موقع پر توشہ خانہ حضورؐ نظام کی طرف سے دیا گیا۔ ایک ماتحت افسر کی غلطی کے سبب سے چیک کے ہمراہ یہ لکھا گیا کہ یہ رقم زکوٰۃ کی مد سے دی گئی۔ چنانچہ علامہ نے اس چیک کو واپس کرتے ہوئے چار اشعار بھیجے جس کے آخری دو اشعار یہ ہیں۔

میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

علامہ اقبالؔ اور حیدرآباد دکن

تاریخی دستاویز کے بموجب علامہ اقبالؔ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ حیدرآباد کے دیدار کی خواہش اقبالؔ کو نوجوانی کے زمانے سے تھی چنانچہ ۱۸۹۹ء میں علامہ اقبالؔ نے کہا تھا ''اگر شوق دیدار حضرت داغؔ اسی طرح رہا تو میں حتماً ایک دن مُلکِ دکن کا سفر ضرور کروں گا''۔ اقبالؔ نے حیدرآباد دکن کا دو بار سفر تو کیا لیکن حضرت داغؔ سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہوسکی کیونکہ داغؔ دہلوی مرحوم ہو چکے تھے۔

علامہ اقبالؔ پہلی بار ۱۸/مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد آئے۔ حیدرآباد کے عوام اور خواص جن میں ادبی سماجی اور سیاسی ممتاز افراد بھی شامل تھے علامہ اقبالؔ کے نام اور پیام وکلام سے واقف تھے کیوں کہ اقبالؔ کا کلام دکن کے مجلّہ جات اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ علامہ اقبالؔ کی سر اکبر حیدری (وزیرِ اعظم ۱۹۳۸ء۔۱۹۴۸ء) مہاراجہ کشن پرشاد (وزیرِ اعظم اور کمانڈر ان چیف) سے نامہ نگاری بھی تھی۔ اس کے علاوہ اُردو اور فارسی کے مشہور شاعر جناب غلام قادر گرامیؔ مقیم حیدرآباد سے دوستانہ روابط برقرار تھے۔ اُس زمانے میں نواب میر محبوب علی حیدرآباد دکن کے حکمران تھے جن سے علامہ اقبالؔ کی ملاقات نہ ہوسکی۔ اس بارے میں ۳۰/مارچ ۱۹۱۰ء کے خط میں علامہ نے جو حیدرآباد کے قیام کے دوران عطیہ فیضی کو لکھا ہے، لکھتے ہیں۔ ''اگر طولانی مدّت کے لیے حیدرآباد میں قیام کروں تو مجھے یقین ہے کہ عالی جناب نظام مجھ سے ملاقات کریں گے۔ حیدرآباد میں مصروف اور سر شناس شخصیتوں سے ملاقات رہی۔ اکثر افراد نے مجھے اپنے گھروں پر دعوت دی۔ جناب سر اکبر حیدری اور ان کا خاندان نہایت شریف مہمان نواز اور علم دوست ہے''۔

حیدرآباد کے قیام کے دوران علامہ اقبالؔ کی خواہش کے مطابق سر اکبر حیدری نے نظمؔ طباطبائی سے موصوف کی ملاقات بھی کروائی جو اُس زمانے میں نظام کالج حیدرآباد میں فارسی زبان کے پروفیسر تھے۔ علامہ کے اصرار پر نظمؔ طباطبائی نے کچھ اشعار سُنائے جنھیں اقبالؔ نے سراہا اور تعریف کی۔ اِس کے علاوہ علامہ نے جلیلؔ حسن مانک پوری سے جو داغؔ دہلوی کے بعد میر محبوب علی پاشا کے

اُستاد بھی ہوئے ملاقات کی۔ جناب ظہیر دہلوی اور مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے اس حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک (۵۸) اشعار پر مشتمل نظم ''گورستان شاہی'' لکھی جسے حیدرآباد سے واپسی پر مجلہ مخزن شمارہ ۵/جون ۱۹۱۰ء میں چند مقدماتی جملوں کے ساتھ شائع کروایا جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

''حیدرآباد کے مختصر قیام کے دوران جناب نذر علی صاحب کے ہمراہ قطب شاہی مقبروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقبرے جن کی عظمت باشکوہ اور جن کی تاریخ درس آموز ہے جہاں سلاطین قطب شاہی آرام کر رہے ہیں۔ یہاں خاموشی ہے، سکوتِ شب میں آسمان پر ابر کے ٹکڑوں کا ہجوم اور چاند کا منظر دردناک اور احساساتی بھی ہے۔ اس منظر نے مجھ پر ایسا اثر طاری کیا ہے جسے میں ہرگز بھول نہیں سکتا یہ اشعار میرے حیدرآباد کے سفر کی یادگار کے ساتھ ساتھ جناب سر اکبر حیدری اور اُن کی بیگم کی مہمان نوازی اور محبت کی یاد بھی تصور کئے جاسکتے ہیں۔ اقبال ۲۳/مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد سے لاہور واپس ہوئے۔ سفر کے دوران دو روز اورنگ آباد میں قیام کیا اور عالمگیر اورنگ زیب کی قبر کی بھی زیارت کی''۔

اُس زمانے میں دہلی، لکھنو کی طرح حیدرآباد دکن بھی علمی ادبی اور ثقافتی راہوں پر گامزن تھا چنانچہ نظام دکن کی علم پروری اور ادب نوازی سے علامہ اقبال باخبر تھے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری۔ استاد جلیل مانک پوری۔ ظہیر دہلوی اور عبدالقادر گرامی جیسی شخصیتوں کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ اس کشش کی ایک وجہ سرزمین دکن میں علامہ اقبال کی قدردانی اور اُردوئے معلیٰ (دہلی لکھنو، آگرہ) کے دبستانوں اور محلات میں علامہ کی زباندانی پر مسلسل اعتراضات بھی شامل تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۷ء میں جسٹس سید ہاشم بلگرامی کے انتقال کی وجہ سے حیدرآباد دیوانعالی میں جج کی نشست خالی ہوئی تو علامہ اقبال نے اس نشست کو حاصل کرنے کے لیے مہاراجہ کشن پرشاد کے خط میں خواہش کا اظہار کیا لیکن قسمت نے یاری نہ کی اور سیاست بازی نے ہمکاری نہ کی اور علامہ کی خدمات سے محکمہ دیوان عالی محروم رہا۔ علامہ کے اس خط میں جو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ہے ہمیں

اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ وہ ایک کتاب اسلام کی فقہ کے بارے میں انگریزی میں لکھیں لیکن عدم فرصتی نے اس کی اجازت نہ دی۔ سر اکبر حیدری نے چند مہینوں بعد علامہ کو قانون کے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی پیشکش کی لیکن اس پیش کش کو علامہ نے قبول نہ کیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر لکچر دینے کے لئے علامہ اقبال بذریعہ ٹرین ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال کو خبر دی گئی کہ وہ نظام حیدرآباد کے مہمان ہیں اس لئے شاہی مہمان خانہ میں قیام کریں۔ اسٹیشن پر طالب علموں کی کثیر تعداد کے علاوہ سر اکبر حیدری، ڈاکٹر عبدالحکیم خلیفہ، ڈاکٹر عبداللہ عمادی، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور دیگر اساتذہ عثمانیہ یونیورسٹی استقبال کے لیے موجود تھے۔ گل پوشی کے بعد طالب علموں نے اقبال کی نظم ''ترانہ ہندی'' پڑھی۔

اقبال اس بار چار دن حیدرآباد میں رہے۔ پہلے دن عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانہ کا جائیزہ لیا اور دفتر کتب خانہ میں اپنا نام ثبت کیا۔ دوسرے دن باغ عامہ میں منعقدہ ایک جلسہ عام میں تقریر کی جس کی صدارت مہاراجہ کشن پرشاد نے کی۔ اُسی رات ضیافت عشائیہ کے بعد مہاراجہ کی حویلی میں محفل مشاعرہ برگزار ہوئی۔ مشہور شعرائے فارسی اور اُردو نے اس مشاعرہ میں شرکت کی جن میں حیدر جنگ نظم طباطبائی، ضیاء جنگ، عزیز یار جنگ، مسعود علی محوی، نظام تیموری، کاظم علی باغ اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے مہاراجہ کے اصرار پر چند فارسی اشعار پڑھے۔ دو شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

زندگی انجمن آرا ونگهدار خود است ای که در قافلۂ بی همه شو باهمه زو

آن نگینی که تو با آهرمان ساخته ای هم به جبرئیل امین هم نتوان داد گرو

تیسرے دن ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو گیارہ بجے علامہ اقبال نے نظام دکن سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران علامہ نے چند فارسی اشعار پڑھے اور ایک نسخہ ''رموز بیخودی'' کا حضور نظام کو پیش کیا۔ حضور نظام نے اقبال سے گلہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جب ہم دہلی آئے تھے تو لاہور قریب تھا تم کیوں ہماری ملاقات کو نہ آئے''؟ اقبال نے جواب دیا اُس روز بیمار تھا چنانچہ اب اُس ایک روز کی تلافی کے

لیے ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کر کے آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ حضور نظام اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں تمھیں وزیر قانون بنا دوں گا۔ اقبالؔ نے فوراً جواب دیا۔ سرکار میری خواہش یہ ہے کہ مجھے آزاد ہی رکھیے۔ پھر اقبالؔ نے حضور نظام سے آئندہ سال کے لیے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کی درخواست کی۔ نظام نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے پنجاب نہ جا سکے۔ علامہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدر آباد سے جنوبی ہندوستان کا دورہ ختم کر کے لاہور کے مقصد کے لیے روانہ ہوئے۔ علامہ نے مدراس میسور بنگلور اور حیدر آباد دکن میں اجتہاد اور فلسفہ اسلامی پر تقاریر کیں۔ موصوف نے بعد میں حبیب ہال لاہور میں جو مقالہ پڑھا وہ مقالہ ''اسلام میں اجتھاد'' تھا جسے وہ حیدر آباد میں پڑھ چکے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسہ کی صدارت کے لیے علامہ کو حیدر آباد جانا تھا لیکن علامہ اپنی مصروفیات اور بیماری کی وجہ سے حیدر آباد نہ جا سکے اور اسی لئے نواب صادق علی خان والیٔ بہاولپور نے جلسہ کی صدارت کی۔

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی

یہ سب کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال نے تین شادیاں کیں تھیں۔ علامہ کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں کریم بی سے ہوئی اُس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال تھی اور ابھی آپ نے میٹرک پاس نہیں کیا تھا۔ علامہ نے یہ شادی والدین کے اصرار پر کی تھی۔ کریم بی اقبال سے تین سال بڑی تھی وہ ڈاکٹر عطا محمد کی بیٹی تھیں جو مشہور سرجن تھے۔ حکومت برطانیہ نے انھیں ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا خطاب دے کر سرجن جنرل کے عہدہ پر فائز کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ وزارت خارجہ برطانیہ میں بھی بحیثیت سفیر کام کر چکے تھے۔ علامہ اقبال اپنے خسر کا بڑا احترام کرتے تھے اور اُن کی زندگی کے آخری وقت تک اُن سے روابط قائم تھے۔ کریم بی کے بطن سے پہلی بیٹی معراج بیگم ۱۸۹۶ء میں اور دوسرا بیٹا آفتاب اقبال ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے معراج بیگم بہت حسین اور نیک لڑکی تھی لیکن عنفوان جوانی میں (۱۹) سال کی عمر میں ۱۹۱۵ء میں گجرات میں انتقال کر گئی۔ علامہ اقبال کی یہ پہلی شادی شروع ہی سے ناراضگی، جدائی اور مشکلات سے دوچار تھی۔ شادی کے پہلے دو سال دلہا دلہن سیالکوٹ میں رہے لیکن اس کے بعد علامہ عموماً تنہا ہی رہے۔ چنانچہ سیالکوٹ کے بعد لاہور کالج میں شریک ہوئے جہاں ہاسٹل میں چار سال تنہا رہے اور کریم بی اپنے باپ کے گھر یا علامہ کے والدین کے ساتھ سیالکوٹ ہی میں رہی۔ علامہ کی ملازمت کے دوران بھی کریم بی نے لاہور میں رہنا پسند نہیں کیا چنانچہ اسی دوران میاں بیوی میں اختلافات بڑھتے گئے اور پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک علامہ یورپ میں بھی تنہا ہی رہے۔ جب اقبال یورپ سے لاہور واپس ہوئے تو اُس وقت بھی کریم بی بہت کم ہی آتی تھیں چنانچہ علامہ نے یہ سوچا کہ طلاق دے دیں لیکن کریم بی راضی نہ ہوئیں اس لئے اقبال نے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک خاص مبلغ ہر ماہ کریم بی کے لیے مقرر رکھا جو علامہ کی آخری عمر تک جاری رہا۔ کریم بی علامہ کے انتقال کے آٹھ سال بعد گجرات میں انتقال کر گئیں اور وہیں دفن ہیں۔ محققین اقبالیات نے علامہ کی اس پہلی شادی میں شکست کے چند اہم اسباب بتائے ہیں۔ علامہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور تمام افراد خانوادہ ایک معمولی سے گھر میں زندگی کرتے تھے جب کہ کریم بی ایک دولت مند گھرانے کی

بیٹی تھی اور اُن کا گھر گجرات میں کسی عالیشان کوٹھی سے کم نہ تھا۔ کریم بی اپنے والدین سے دور رہنا پسند نہیں کرتی تھیں اور علامہ ہمیشہ سیالکوٹ اور گجرات سے دور معاش اور تحصیلات کی تلاش میں مصروف رہتے تھے۔

عطیہ فیضی نے اس شادی کی شکست کی اصلی وجہ دونوں کی فکری صلاحیتوں میں شدید فرق اور طبیعتوں میں اختلاف بتلایا ہے۔ یہی فکری اور مزاجی اختلاف سے علامہ پریشان اور رنجیدہ تھے چنانچہ ۹/اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں کہ ''اب صرف آرزو یہی ہے کہ میں اس شہر سے کہیں باہر نکل جاؤں۔ تم کو معلوم ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات اور محبتوں میں گھرا ہوا ہوں یہ لوگ مجھے کریم بی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جو ممکن نہیں۔ میں پہلے ہی سے اس شادی سے خوش نہ تھا۔ میں حاضر ہوں کہ اخراجات کفالت برداشت کروں لیکن اُس کے ساتھ زندگی بسر نہ کروں''۔ اسی وجہ سے علامہ اقبالؔ اور اُن کے بڑے فرزند آفتاب اقبال کے تعلقات بھی روز بروز خراب ہوتے گیے کیونکہ آفتاب اس شادی کی شکست کی پوری ذمہ داری علامہ پر دے رہے تھے چنانچہ وقت کے گذرتے ہوئے یہ اختلافات شدید تر ہوتے گئے آفتاب اقبال نے ۱۹۷۹ء میں ۸۱ سال کی عمر کر کے داعی اجل کو لبیک کہا اور اُن کے جنازے کو لندن سے کراچی لایا گیا جہاں وہ دفن ہیں۔ پہلی شادی کے (۱۷) سال بعد ۱۹۱۵ء میں علامہ نے دوسری شادی کی۔ مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ علامہ کے ایک وکیل دوست گلاب الدین نے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی کی نسبت لگائی جو موچی دروازے لاہور میں رہتی تھی۔ اس لڑکی کا نام سردار بیگم تھا جو ویکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی۔ جب شادی کی بات پکی ہوگئی تو اقبالؔ چند دوستوں کے ہمراہ بارات کی شکل میں دلہن کے گھر گیے جہاں نکاح تو پڑھا گیا لیکن اُس وقت دلہن اقبالؔ کے گھر نہ آسکی چونکہ اُس وقت علامہ کو چند خطوط اور تحریریں دیں گئیں جن میں سردار بیگم کے اخلاق اور رفتار پر شک اور انتقاد کیا گیا تھا۔ چنانچہ اقبالؔ بہت رنجیدہ ہوئے اور دوستوں سے کہا کہ ان اطلاعات کے بارے میں تحقیقات کی جائے۔ کہتے ہیں کہ اقبالؔ نے سردار بیگم کو طلاق بھی دینا چاہا لیکن سردار بیگم اپنے باپ ہی کے گھر رہیں اور طلاق لینے سے انکار کر دیا۔

اس دوسری شادی نے اقبالؔ کی اذدواجی زندگی کو اور پر آشوب بنا دیا چنانچہ تقریباً تین سال سردار بیگم باپ ہی کے گھر رہیں۔ اقبالؔ کے دوستوں کو اقبالؔ کی شکست خوردہ اور پریشان حال اذدواجی زندگی پر ترس آیا چنانچہ دوستوں نے اقبالؔ کو تیسری شادی کرنے پر راضی کیا۔ علامہ کے دوست سید بشیر حیدر نے دوشیزہ مختار بیگم جو لدھیانہ کے لکھ پتی خاندان کی بیٹی تھی علامہ سے شادی کی نسبت طے کی چنانچہ ۱۹۱۳ء میں مختار بیگم سے شادی ہوئی اور دلہن لدھیانہ سے شوہر کے گھر محلہ انارکلی لاہور میں آ گئی۔ اِسی دوران علامہ کے دوستوں نے اُن مشکوک تحریروں کی تحقیق کی جو سردار بیگم کے اخلاق اور رفتار کے خلاف تھیں تو معلوم ہوا کہ ایک مقامی وکیل نے یہ جعلی خطوط لکھے تا کہ سردار بیگم کی شادی اُس کے لڑکے سے ہو سکے۔ جب اقبالؔ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بہت غمگین ہوئے۔ سردار بیگم نے ۳ سال صبر کرنے کے بعد اقبالؔ کو خط میں لکھا کہ ''میں تمھارے نکاح میں ہوں۔ مجھ پر جو بہتان اور تہمت باندھی گئی ہے اُس پر تم کو یقین نہ کرنا چاہیے تھا۔ مجھے دوسری شادی کی فکر نہیں ہے۔ میں تمام زندگی اسی طرح گذار دوں گی لیکن روز قیامت تمہارا دامن پکڑ کر انصاف طلب کروں گی''۔ اس خط کا اقبالؔ پر سخت اثر ہوا جب اقبالؔ نے اس خط کو مختار بیگم کو سُنایا تو وہ رونے لگیں چنانچہ اقبالؔ نے مختار بیگم کے کہنے ہی پر دوبارہ نکاح پڑھوا کر سردار بیگم کو انارکلی کے گھر میں رکھا۔ اب اس گھر کی رونق میں عجیب اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ اُس زمانے میں ایک ہی مکان میں سردار بیگم، مختار بیگم اور اقبالؔ کی بہن کریم بی اپنے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ علامہ کا گھر دوستوں اور رشتہ داروں کی ملاقات کا مرکز بھی بن چکا تھا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک یعنی دس سال کے عرصے میں اگرچہ سردار بیگم اور مختار بیگم اقبالؔ کے ساتھ زندگی گذار رہی تھیں لیکن صاحب اولاد نہ ہو سکیں اور اتفاقاً ۱۹۲۴ء میں دونوں بیویاں ایک ہی زمانے میں حاملہ ہوئیں چنانچہ مختار بیگم اپنی ماں کے پاس لدھیانہ گئیں لیکن وہاں شدید بیمار ہو گئیں۔ علامہ مختار بیگم کے آخری وقت لدھیانہ پہنچے اور اُن کے مرنے سے کچھ منٹ قبل بات چیت کی۔ مختار بیگم کی موت کا اقبالؔ پر بڑا اثر ہوا جو اُن کے بعض خطوط اور لوح قبر پر کندہ اشعار سے واضح ہے۔

سردار بیگم کے بطن سے ۱۹۲۴ء میں سیالکوٹ میں جاوید اقبال پیدا ہوئے اور اُسکے بعد آٹھ سال بعد ایک لڑکی منیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ سردار بیگم ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئیں اور لاہور میں دفن ہیں۔

علامہ اقبالؔ پر تہمت شراب نوشی

علامہ اقبالؔ نے بانگ درا میں زہد اور رندی کے عنوان پر جو نظم لکھی اُس میں اپنی شخصیت کا ایک مختصر لیکن جامع خاکہ پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ع۔ اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے

ع۔ مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے

یہ اقبالؔ کا خود اقبالؔ پر بہت صحیح اور معقول ریویو ہے۔ جدید علم تحقیق کے اصولوں کے تحت ہر متنازعہ مسئلہ کو جذباتی اور عقیدتی اثر کے تحت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یعنی اگر کسی معتبر شخصیت پر کسی رکیک فعل کا الزام لگایا گیا ہے تو اُسے وقتی طور پر فراموش کرنے یا اُس پر بحث نہ کرنے سے وہ ختم نہیں ہوتا بلکہ الزام شدید اور محکم تر ہوتا جاتا ہے اس لیے ان متنازعہ مسائل پر بھی گفتگو لازم ہے تا کہ الزام کی تردید مین مستند حوالا جات اور گذارشات دفتر تاریخ میں ثبت ہو جائیں اور حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔

علامہ اقبالؔ پر ابو محمدؐ دیدار علیؒ خطیب مسجد وزیر خان نے کفر کا فتوی صادر کیا۔ بہت سے نام نہاد علماء اور مولویوں نے ملحد، زندیق، حوس راں، عیاش، غنائی کے علاوہ شرابی جیسے اتہامات کے انبار لگائے کیوں کہ یہ کم عقل ملا علامہ کی روشن فکری سے خوف زدہ تھے جس سے اُن کے ریاکارنہ افعال کی نقاب کشی ہو رہی تھی۔ علامہ پر مختلف الزامات عاید کر کے وہ عام فہم لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اقبالؔ مسلمان نہیں ہے اس لیے مصلح قوم یا مبلّغ دین اسلام نہیں ہو سکتے۔ یعنی دوسرے معنی میں وہ علامہ کی سیاسی مذہبی اخلاقی اور علمی شخصیت کا قتل کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے ہر ذریعہ اور حربہ کو جائیز سمجھتے تھے۔ فارسی محاورے کی رو سے ؎ تا نباشد چیزکی مردم نگویند چیزھا

یعنی جب تک کوئی بات نہ ہو لوگ اُس کا بتنگڑ نہیں بناتے۔ ہمیں اس مضمون میں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا مسائل تھے جن کی وجہ سے یہ اتہامات علامہ پر عاید کیئے گیے۔ ہماری تمام تر گفتگو مستند حوالوں اور منطقی اصولوں پر ہوگی اور ہم یہ ثابت کریں گے کہ علامہ نے عمر بھر شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کو آواز اور ساز سے بچپن سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ اِسی لیے علامہ نے کالج کی تحصیل